زخم

قیمت فی کاپی ۸ر

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے وادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالا اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصۂ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، انگیفی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصۂ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہے انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی (۱)

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

ان تینوں جلدوں میں [illegible] سے لیکر [illegible] تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ - مشکی قوام - الائچی دانہ - تیل - عطر - عرق کیوڑہ و گلاب - اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبّی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے ——— فہرست طلب فرمائیے

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ

ٹیلی فون :- ہوڑہ، ۴۵۵

شاخیں :-

(۱) ۵۷/۱ - کیننگ اسٹریٹ کلکتہ
(۲) ۲۱۰ - ہریسن روڈ - کلکتہ
(۳) ۹/۸ - راجہ گڑہ اسٹرانڈ روڈ - بمبئی
(۴) ۶۱ - ارسکین روڈ - بمبئی
(۵) ۴۱۸ - ڈنگن روڈ - بمبئی
(۶) ۱ - دارودالا برج اسٹیشن روڈ - پونا
(۷) ۱۸۳۸ - کانپور چکلا - احمد آباد
(۸) ۹۳ - مغل ٹولی - مٹفورڈ روڈ - ڈھاکہ

موجودہ ادب سے انتخاب

نظم

بانگ درا ... مجلد ... اقبال ... للعہ
بال جبریل ... " ... " ... للعہ
ضرب کلیم ... " ... " ... ۷ے
زبور عجم ... " ... " ... للعہ
ارمغان حجاز ... " ... " ... للعہ
پس چہ باید کرد مسافر ... " ... ۸ے
پیام شباب ... قاضی نذرالاسلام ۱۲ے
شعلہ و شبنم ... جوش ملیح آبادی ... صر
عرش و فرش ... " ... " ... للعہ
حسین اور انقلاب " ... " ... عہ
شعرستان ... اختر شیرانی ... عہ
دھڑکنیں ... احمد ندیم ... ۸ے
لطاف کے گیت ... الطاف مشہدی ۸ے
گلبانگ حیات ... امین حزیں ... ۷ے
کفر و ایمان ... بہزاد لکھنوی ... ۸ے
تعلقہ ... حاجی تعلق ۱۲ے ؛ منقار تعلق ۸ے
گیت مالا ... صلاح الدین میراجی ... ۸ر
رنگ بست ... اثر لکھنوی ... ۸ے
نقش چغتائی ... چغتائی ... عہ
مرقع چغتائی ... " ... ۱۴ے

نثر

رحمت اللعالمین، مکمل تین جلد ... قاضی سلیمان ۔ معہ ۱۴ے
مقالات جمال الدین افغانی مترجم سید ایم ڈی ۔ ایم اے ۔ ۸ے
راہگذر ... عاشق بٹالوی (افسانے) ... ۸ے
پطرس کے مضامین ... پطرس (مزاحیہ) ... ۸ے
مضامین فلک پیما ... (مزاحیہ) ... ۸ے
کیلے کا چھلکا ... سندباد جہازی (مزاحیہ) ... ۸ے
گنجہائے گرانمایہ ... رشید احمد صدیقی ... ۸ے
گفت و شنید ... بشیر ہاشمی ۔ ۸ے ؛ گرد و پیش (افسانے) ۷ے
خوفناک دنیا ... سید محمد علی شاہ (اول، دوم) ... ۱۲ے
اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ... ڈاکٹر عبداللہ ... ۱۲ر
خار و گل ۔ ایم اسلم للعہ ؛ مزاحیہ ڈرامہ ... خلیل ... ۸ے
ٹیپو سلطان ۔ امجد علی ۸ے ؛ جرم و سزا ۔ باری علیگ ... ۴ے
جاہ و جلال ۔ تبسم ۸ے ؛ دروازہ ... کرشن چندر ... ۸ے
شب غم ۔ ایم ۔ اسلم ۱۴ے ؛ کروٹ ۔ منٹو ۱۴ے ؛ منٹو کے مضامین ۸ے
لیلیٰ کے خطوط ... قاضی عبدالغفار ... ۸ے
اس نے کہا ... " ... " ... ۸ے
مجنوں کی ڈائری " ... " ... ۸ے
افسانہ زریں ۔ اسمار طیب حسین ۸ے ؛ جواب ۔ کرنل مجید ملک عہ
شمع ... اے آر خاتون (ناول) ... صر
تصویر ... " ... " ... للعہ

تاریخ اسلام
سید امیر علی شاہ
کا
مکمل تین جلدوں
میں بامحاورہ
اور سلیس ترجمہ
از
باری علیگ
فی حصہ ۱۴ے
مجلد مکمل ہر سہ حصہ
۴۰ے

نوٹ : مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اُردو اکاڈیمی لاہور

نگار

مدیر اعلیٰ : نیاز فتحپوری

جلد ۴۹	فہرست مضامین جون سنہ ۴۶ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۴

نقد و انتقاد کا ایک اہم مسئلہ ---------- عبدالقادر ام۔اے۔ ---------- ۹

رجب علی بیگ سرور کے خطوط ---------- محمد حسین انور (مسلم یونیورسٹی) ---------- ۱۶

تاریخ اودھ کا ایک دلچسپ ورق ---------- شیخ تصدق حسین (بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی) --- ۲۳

ہنسی ---------- ابراہیم جلیس ---------- ۳۰

قدیم سنسکرت لٹریچر ---------- ا۔ح ---------- ۳۴

ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلامی نظریۂ سیاست --- سید اختر علی تلہری ---------- ۴۱

توام بچے ---------- ف۔ا۔ص ---------- ۴۹

مالہ و ماعلیہ ---------- ۵۲

باب الاستفسار ---------- ۵۵

تعارف (نظم) ---------- پروفیسر شور ---------- ۵۹

کیف خیال (نظم) ---------- اشعر ملیح آبادی ---------- ۶۰

کلام امتہ الرؤف فسریں --- غزل --- قہر اکبر آبادی ---------- ۶۱

دلچسپ معلومات ---------- ۶۲

ملاحظات

کیبنٹ مشن کا فیصلہ

ہندوستان کی تاریخ میں پچھلے دو مہینے غالباً کبھی نہ بھلائے جائیں گے، کیونکہ سرزمین ہند کی عمر میں اس کی آزادی کا عملی سوال سب سے پہلے انھیں دو مہینوں میں سامنے آیا اور اگر بدقسمتی سے اب بھی اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو "آسماں راحق بود گر خود بہ گرید بر زمیں"

یونتو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ کا سلسلہ بہت عرصہ سے چلا آرہا تھا، لیکن ان کی نوعیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی معالج دوا کے بہانے آہستہ آہستہ زہر پلاتا رہے اور مرض بجائے دور ہونے کے اور شدت اختیار کرتا جائے۔ یہاں تک کہ ملک نے اسے رفتہ رفتہ محسوس کرنا شروع کیا اور اس معالج کی طرف سے عام بیزاری پیدا ہوگئی۔

ہندوستان کا مطالبۂ آزادی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تقریباً نصف صدی سے یہ جذبہ آہستہ آہستہ قوی ہو رہا تھا، لیکن چونکہ انقلابی قوتیں اتنی زبردست نہ تھیں کہ دشمن کا مقابلہ کرسکتیں، اس لئے "نقشِ امید" ہمیشہ بن بن کر بگڑتا رہا اور حکومت نے ہمیشہ اس سے فایدہ اُٹھایا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی شروع ہوئی اور ہندوستان نے اس امید پر کہ کامیابی کے بعد برطانیہ یقیناً ہندوستان کے مطالبات پورے کرے گا، کسی قربانی سے گریز نہ کیا۔ لیکن جب جنگ کے بعد بھی ملک کی گردن سے طوق غلامی جدا نہ کرنے کے لئے متعدد بہانے تلاش کئے جانے لگے، تو ملک کی برہمی میں شدت پیدا ہوئی، لیکن یہ شدت ایسی نہ تھی جو حکومت کے تیغ و تفنگ کا مقابلہ کرسکتی، اس لئے وہ سوائے اس کے کہ زخموں سے کراہتا رہتا کچھ نہ کرسکا، اور برطانیہ جسے اپنے نشۂ کامیابی میں دوسری جنگ کے امکان کا اندیشہ بھی نہ ہوسکتا تھا، ملک کے اس درد و کرب کو دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب دس سال کا زمانہ اسی ظلم و تظلم پر گزر گیا تو قدرت نے ان مظالم کا بدلہ لینے کے لئے ایک اور "ظالم تر انسان" پیدا کیا اور اس طرح وہ دوسری جنگ شروع ہوئی، جس نے نہ صرف زمین کا نقشہ بلکہ تمام آئین و سبر جدل کر رکھدیا اور دنیا کے بہت سے سیاسی حقایق کو اوہام میں تبدیل کر دیا۔

پھر اگر یہ جنگ نہ ہوتی، تو کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ برطانیہ جو زمانۂ دراز سے دنیا پر مالی و اقتصادی حکومت کرتا چلا آرہا تھا، ایک مقروض و دیوالیہ سلطنت کی حیثیت اختیار کرلیگا، کیا کوئی گمان کرسکتا تھا کہ امریکہ جو نہ الصبح ہستی ملک ہے

مشرق و مغرب میں اتنی زبردست استعماری اقتصادی اور سیاسی اہمیت حاصل کریگا کہ بات بات میں اس کی نگاہ کو دیکھنا پڑے گا، کیا یہ بات کسی کے ذہن میں آسکتی تھی کہ روس جس کے مٹانے کے لئے ساری دنیا تلی ہوئی تھی تمام وسط یوروپ پر چھا جائے گا اور بالشویت "حقیقت ثابتہ" کی ہوکر رہ جائے گی۔ کیا اس کا بعید سے بعید امکان تھا کہ انڈونیشیا ایسی دور اُفتادہ جگہ حس سرزمین میں آزادی و خود مختاری کے جذبات اتنے قوی ہو جائیں گے کہ دشمن کو ان کے سامنے سر جھکا دینا پڑے گا۔ مگر یہ سب کچھ سامنے آیا جس کی کوئی توقع نہ تھی اور اسی کے ساتھ ہندوستان نے بھی محسوس کیا کہ جس طرح پہلی جنگ میں حکومت کے مواعید نقش بر آب ثابت ہوئے تھے، اسی طرح اب بھی ہونگے اور اس کی یہ بے چینی اب عام آبادی سے گزر کر ان جماعتوں اور اداروں میں بھی پہونچ گئی، جن کو حکومت اپنا دست و بازو سمجھتی تھی اور اس طرح ایک سخت منزل برطانیہ کے سامنے آئی۔ پھر اگر صرف ہندوستان ہی کی سیاسی گتھی سامنے ہوتی تو برطانیہ شاید اب بھی اس کی زیادہ پروا نہ کرتا، لیکن ایک طرف اس کا اقتصادی انحطاط، صنعتی و تجارتی نظام کی بربادی، قرض کا غیر معمولی بار، دوسری طرف روس کے بڑھتے ہوئے اثرات جو مشرق میں حدود ہند تک اور مغرب میں وسط یوروپ سے لیکر سواحل بحر روم تک پہونچ رہے ہیں، ماحول و زمانہ کے پیدا کردہ بین الاقوامی اثرات جنھوں نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرے اور عقلمندی کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ فیصلہ ایسا ہو، جو ترک حکومت کے بعد بھی اسے ہندوستان سے فایدہ اُٹھانے کا زیادہ سے زیادہ موقعہ دیسکے یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں اختلاف و تفریق برطانیہ ہی کی لائی ہوئی برکت ہے، لیکن اب حالات کا اقتضاء یہ نہیں ہے کہ وہ اب اس اختلاف سے فایدہ اُٹھا سکے، کیونکہ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوستان بہرحال آزاد ہو کر رہیگا اور اگر یہ آزادی اس نے جنگ کر کے حاصل کی تو ایک طرف برطانیہ کی آیندہ تجارتی توقعات کو نقصان پہونچے گا اور دوسری طرف روس کو یہاں اپنے اثرات وسیع کرنے کا زیادہ موقعہ مل جائے گا۔ یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ کیبنٹ مشن کی نیت خراب نہ تھی، لیکن وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ جو مقصد نیت خراب کرنے کے بعد حاصل ہو سکتا تھا، وہ کانگرس اور لیگ کے باہم اختلاف کی وجہ سے یوں بھی پورا ہو جائے گا اور آخر کار پورا ہو کر رہا۔

کیونکہ جو فیصلہ خود یہاں کی قوموں کو ملکر کرنا چاہئے تھا وہ کیبنٹ مشن کے ہاتھ میں دیدیا گیا اور کیبنٹ مشن نے جو فیصلہ کیا ہے اُس کی روح چاہے جو کچھ ہو، لیکن جہاں تک الفاظ اور استدلال کا تعلق ہے وہ یقیناً ایک ایسی دستاویز ہے جس کو رد کرنا آسان نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کیبنٹ مشن نے جو تجاویز پیش کی ہیں، وہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے مطالبات

سے ہٹی ہوئی ہیں، یہ بھی درست ہے کہ اس میں نہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہے نہ اس امر کا اظہار کہ انگریزی فوجیں یہاں سے کب ہٹائی جائیں گی، لیکن باوصف اسکے اس دستاویز پڑھنے سے ہر شخص اسی نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ کیبنٹ مشن ہندوستان کی آزادی کی راہ میں خود اپنی طرف سے کوئی سنگ گراں حایل کرنا نہیں چاہتی۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ مشن نے کوئی دقیقہ اس امر کی کوشش میں اُٹھا نہیں رکھا کہ یہاں کی تمام جماعتیں ملکر کوئی متفقہ فیصلہ ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت کے متعلق کرسکیں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور اس صورت میں انھوں نے خود اپنی طرف سے جو تجاویز پیش کی ہیں اُن پر یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

کانگرس اور لیگ کی طرف سے اس وقت تک جو اظہار خیال کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کو مشن کی تجاویز سے کچھ نہ کچھ اختلاف ہے اور ابھی تک انھوں نے فیصلہ نہیں کیا کہ وہ اُن کو قبول کریں گی یا نہیں، لیکن فیصلہ سے قبل لیگ و کانگرس دونوں کو اپنی اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ان تجاویز کے رد کر دینے کی صورت میں کیا نتائج برآمد ہوں گے۔

لڑائی میں بہت سے موقعے ایسے بھی آتے ہیں جب سپر ڈال دینے ہی سے کام چلتا ہے اور اگر مشن کی تجاویز کو قبول کرنا واقعی سپر ڈالنے کے مترادف ہے، تو بھی انھیں منظور کرلینا چاہئے، کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اُصولی طور پر طے ہو چکا ہے اور اب صرف تدبیر و عمل سے اس کو بروئے کار لانا ہے۔

اس وقت تک کانگرس اور مسلم لیگ نے اس باب میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی، لیکن زیادہ سے زیادہ وسط جون تک یہ امر طے ہو جانا ہے کہ ہندوستان کی حکومت بدستور انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گی یا کیبنٹ مشن کی تجاویز پر عمل کرکے اکابر قوم خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

کانگرس اور مسلم لیگ کی طرف سے بعض تجاویز کے متعلق جو ایضاح و صراحت چاہی جا رہی ہے، وہ اب بالکل بعد از وقت ہے، کیونکہ خود مشن اپنی تجاویز میں اب کسی قسم کا رد و بدل نہیں کرسکتی۔ وہ ایک ایسی قانونی دستاویز ہے، جس کو پارلیمنٹ ہی منسوخ کرے تو کرے، دوسری کوئی جماعت ایسا نہیں کرسکتی۔ لیکن اگر ہندو مسلمان دونوں متفقہ طور پر اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہیں، تو آسانی سے کرسکتے ہیں اور مشن کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

اس وقت تک کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کا رجحان ان تجاویز کے قبول کرنے کے لئے بہ نسبت کانگرس کے کمزور ہے، یعنی اس کا امکان ہے کہ قائداعظم ایک مرکزی حکومت کے قیام کو منظور نہ کریں اور پاکستان کے لئے بالکل علحدہ خود مختار حکومت کی تشکیل پر اصرار کرتے رہیں، اور اگر یہ خیال صحیح نکلا، تو پھر کانگرس،

غیر مسلم لیگی مسلمان اور دوسری جماعتوں سے وزراء کا انتخاب عمل میں آئے گا اور مسلم لیگ کے لئے دو ہی راستے باقی رہ جائیں گے، یا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے، یا پھر اس کے خلاف عملی احتجاج شروع کرے اور یہ دونوں صورتیں اس کے لئے غیر مفید ثابت ہوں گی اور ملک میں بدامنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

بہرحال بحالات موجودہ عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ درمیانی حکومت کی پیشکش کو قبول کر لیا جائے۔ یقین ہے کہ وائسرائے خواہ مخواہ نظم و نسق میں دخل نہیں دیں گے، اور اگر انھوں نے اپنے ذاتی اختیارات رد و قبول کے بے محل استعمال کئے، تو وزراء کی جماعت ہر وقت کام چھوڑ سکتی ہے اور اس حالت میں وائسرائے اس کے ذمہ دار قرار پائیں گے۔

ملک اس وقت فقر و فاقہ کے جس تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہے، اس کا اقتضاء یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ اس میں مزید بے چینی اور بدامنی پیدا کر کے حالات کو زیادہ نازک بنا دیا جائے۔

دنیا کے تمام اہم مقاصد، ہمیشہ تدریج ہی کے ساتھ حاصل ہوا کرتے ہیں اس لئے ملک کی آزادی بھی تدریج ہی سے حاصل ہوگی اور نشیب و فراز سبھی سے ہم کو گزرنا ہوگا۔

کاغذ کا مسئلہ

پچھلے مہینے، ہم نے کاغذ کی دشواریوں کا کچھ ذکر کیا تھا اور خیال تھا کہ جون سے ضخامت میں کچھ کمی کر کے مسطر گنجان کر دیا جائے گا، لیکن چونکہ ابھی تک نیوز پرنٹ ہم کو مل رہا ہے اور سفید کاغذ استعمال کرنے پر ہم مجبور نہیں ہیں، اس لئے کم از کم جولائی تک تو صورت حال غالباً یہی رہے گی۔ اگست کے متعلق ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ نگار کس کاغذ پر شایع ہوگا۔

ہم نگار کو سفید کاغذ پر چھاپنے کے لئے بڑی خوشی سے طیار ہیں لیکن سب سے بڑا مانع یہ ہے کہ بازار میں نگار کے سائز کا کاغذ بہت مشکل سے دستیاب ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے حصول کی اجازت کا تعلق مرکزی حکومت سے نہیں بلکہ صوبہ کی حکومت سے ہے اور وہ فراہمی کاغذ کی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتی۔ بہرحال اس باب میں مراسلت جاری ہے اور ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ غالباً آیندہ ماہ کی اشاعت میں ہم بتا سکیں گے کہ نتیجہ کیا نکلا۔

نگار کا جوبلی

ابھی تک تجویز ہی کی منزل میں ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا اور کیسا ہوگا۔ اس تعویق کا تعلق ایک طرف تو میری دماغی اُلجھنوں سے ہے، جن میں بدقسمتی سے ابتک کوئی کمی نہیں ہوئی اور دوسری طرف کاغذ کی فراہمی سے — لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ نگار کا سالنامہ ضرور شایع ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ اگر وہ جوبلی نمبر نہ ہو تو جوبلی نمبر سے بہتر کوئی چیز ہو۔

آیندہ اشاعتوں کی بعض اہم خصوصیات

اس ماہ کی اشاعت میں ایک سلسلہ "سنسکرت لٹریچر کی تاریخ" کا شروع ہوتا ہے جو نہایت مفید و دلچسپ ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہیگا۔ دوسرا سلسلہ مودودی جماعت کی اسلامی تحریکات سے تعلق رکھتا ہے اور یہ بھی اس وقت تک قایم رہے گا جب تک میں خود کسی نتیجہ پر پہونچکر اپنی رائے کا اظہار نکروں افسوس ہے کہ مجھے اس وقت تک اس جماعت کے لٹریچر کا غائر مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں ملی، لیکن مختلف رسایل کے مختلف حصوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ مودودی تحریک کے متعلق اُصول و فروع فکر و عمل، اور دعویٰ و استدلال ہر حیثیت سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو مقالہ مولوی اختر علی صاحب تلہری نے شروع کیا ہے وہ آیندہ مہینے ختم ہو جائے گا، لیکن اس کے بعد ہی دوسرے مقالوں کی اشاعت شروع ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ یہ ابتداء مجھی سے ہو۔

ایک معاون کی ضرورت

میں اب شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ نگار اور دارالاشاعت نگار کے لئے مجھے ایسے مخلص معاون کی ضرورت ہے، جو اس تمام بار کو اپنے سر لیلے اور سال میں چند ماہ مجھے بالکل خاموش و تنہا زندگی بسر کرنے کے لئے موقعہ دیسکے۔ مجھے اس خدمت کے لئے کسی سند یافتہ شخص کی ضرورت نہیں، بلکہ ایسے خوش ذوق، محنتی اور ذہین انسان کی ضرورت ہے، جو اچھا انشا پرداز ہو اور عربی و انگریزی مقالات کا صاف و سلیس ترجمہ کر سکتا ہو۔

اگر فرائض ادارت انجام دینے کا کوئی سابق تجربہ نہ ہو تو بھی چنداں مضایقہ نہیں کیونکہ ایک ذہین شخص چند ماہ میں اُصول ترتیب اور اسلوب کار اچھی طرح سیکھ سکتا ہے۔

معاوضہ کے متعلق میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ نگار زیادہ سے زیادہ جو کچھ دیسکتا ہے اس سے کبھی دریغ نہ ہوگا اور آیندہ کی ترقی خود کام کرنے والے کے اختیار میں ہوگی۔

اگر کوئی صاحب اس کام میں میری اعانت و ہمدردی کے لئے آمادہ ہوں تو ازراہ کرم جلد توجہ فرمائیں۔

ایک بے مثل ادبی شاہکار

نگار میں یونتواب بھی فسانے شایع ہوتے رہتے ہیں اور وہ سب بعض حیثیتوں سے کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور رکھتے ہیں، لیکن کسی آیندہ اشاعت سے ہم ایسے ادبی شاہکار کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں، جس کی نظیر آپ کو شاید ہی کہیں مل سکے۔

یہ ایک رومان محبت ہے، لیکن اس قدر لطیف، اتنا دلدوز اور اتنی بلند و نازک تخییل رکھنے والا کہ انسان کے نازکترین احساسات متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور آپ ان اثرات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ آیندہ اشاعت ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

نقد و انتقاد کا ایک اہم مسئلہ

ابلاغ (Communication)

بیسویں صدی میں فن نقد ایک اعلیٰ اور اونچی سطح پر پہونچ گیا ہے، اور اس نے ناقد اور قاری کو فنی شہ پاروں سے لطف اندوز ہونے اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں نقد و نظر کے نئے زاویوں سے روشناس کیا ہے۔

بیسویں صدی میں تنقید کے چار مشہور دبستانوں سے ہم متعارف ہوتے ہیں :-

(۱) "نفسیاتی" جس میں فنی تجربات کی نفسیاتی تشریح ملتی ہے۔ ادبی تنقید میں اسکی ابتدا رچارڈس سے ہوئی۔

(۲) "تاریخی" جس نے ماضی کی روشنی میں حال کے مسائل کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور جسکے نزدیک ہر فنی شاہ کار کو "روایت پرستی" اور "انفرادیت" کا حسین امتزاج ہونا چاہئے۔ (ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)

(۳) حیاتیاتی، جس نے ادب اور تنقید کو سائنس میں شامل کرکے ادب کی نوعیت کو حیاتیائی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ (ایسٹ مین)

(۴) "منطقی" جس میں ادب میں ماورائیت، آزاد نظم، ابہام اور ہیئت سے بے نیازی، کی مخالفت تنقید جدید کا ایک نیا دھارا ہے۔ (ونٹر)

تنقید جدید کی سب اہم خصوصیت فن کا نفسیاتی مطالعہ ہے اور اس دبستاں کا امام رچارڈس ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ تنقید جدید کی ابتدا رچرڈس سے ہوئی۔ ہم اس مضمون میں رچرڈس کی تنقید کے ایک اہم حصہ سے بحث کریں گے۔

آرٹ کی نفسیات دو اہم مسئلوں سے عبارت ہے۔ حسن کی تخلیق اور حسن سے لطف اندوزی اور اس کے تجزیہ کے لئے ہمیں ایک طرف فنکار کی نفسیات کا مطالعہ کرنا ہے اور دوسری طرف ناظر کی نفسیات کا۔

سب سے پیچیدہ مسئلہ فنکار کی نفسیات ہے۔ ایک فنی شہ پارہ کی تخلیق میں اس پر کیا گزرتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو اسے کسی جذبہ کے اظہار پر مجبور کرتی ہے۔ اور اس کے اظہار میں اسے کن مراحل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فن کی تخلیق سے اس کا کوئی مقصد ہے یا نہیں، اگر ہے تو کیا؟ کیا آرٹ محض فراریت ہے؟ یا زندگی اور

زندگی کے مسائل کا شعور ہے۔ فن کی تخلیق شعوری ہے یا غیر شعوری' — یہ ہے وہ اہم مسئلہ جس کی پیچیدگی کی ایک جھلک ہم کو شاعری کی مختلف اور متضاد تعریفوں میں ملتی ہے۔ اور اس بحث کو چھیڑنا ایک ایسے خار زار میں قدم رکھنا ہے جہاں ہر قدم پر دامن کے اُلجھنے کا احتمال ہے۔

ہمارا موضوع بحث فن نقد ہے۔ جس کا تعلق قاری کی نفسیات سے ہے اور قاری کی نفسیات کو سمجھنا ناقد کے فرائض اور اس کی مشکلات کا پتہ لگانا ہے۔

فنِ نقد کا مسئلہ دو اہم سوالوں کو پیش کرتا ہے۔ یا رچرڈس کے الفاظ میں فنِ نقد کی عمارت دو ستونوں پر ایستادہ ہے (۱) ابلاغ communication اور (۲) اندازۂ قدر و قیمت Evalnation

شاعر ایک جذبہ سے متاثر ہوتا ہے اور اس کو اپنے الفاظ کا قیدی بناتا ہے۔ ناقد کو سب سے پہلے یہ سمجھنا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کے اظہار میں شاعر کو کامیابی ہوئی ہے یا نہیں۔ (۲) جو کچھ شاعر نے ظاہر کیا ہے، آیا وہ اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ اس کا اظہار کیا جائے اور اس کے بعد اسکی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا۔

نقد و انتقاد کا سب سے بڑا مرحلہ اُس جذبہ تک پہونچنا ہے جو فنکار کا مقصود ہے۔ جب ہم شاعر کے تجربہ پر قابو پالیتے ہیں، جب ہم اس جذبہ کو سمجھنے کے لئے جس ذہنی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو آسانی سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ناقد کو اپنی منتہائے مقصود۔ (قدر و قیمت کا اندازہ لگانا) پر پہونچنے کے لئے پہلی منزل سے گزرنا ضروری ہے اور یہ ایک ایسی کٹھن منزل ہے جسکا راستہ پھندوں سے خالی نہیں اور اکثر و بیشتر قاری یا ناقد اپنی منزل کو پہونچنے سے قبل ہی ان پھندوں کا شکار ہوجاتا ہے

ناقد کے عقائد، اس کے تعصبات، اس کی ذہنی ساخت، اس کے شعوری اور لاشعوری تلازمات اُس جذبہ تک پہونچنے میں حائل ہوتے ہیں جو فنکار کا مقصود ہے۔ اعجوبہ تو یہ ہے کہ تنقید کے ایک مشہور دبستان کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے جس کے نزدیک فنکار کی مقبولیت کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس کے فنی شہ پارے میں ایسی صلاحیت ہو کہ قاری کے کسی نفسیاتی پہلو کو اپنی طرف جذب کرنے میں کامیابی حاصل کرسکے۔ گویا قاری کا دماغ فنکار کے "رنگوں کا بکس" ہے اور فنکار کے لئے کسی نئے رنگ کا استعمال جو اس بکس میں شامل نہیں، اس کی مقبولیت کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ اس دبستان کا مشہور ہیرو اناطول فرانس ہے چنانچہ وہ کہتا ہے:

"یونیورسٹی کے شعبۂ ادب کے ایک لکچرار کو اپنے طالب العلموں سے یہ کہنے کے بجائے کہ "میں آج ملٹن یا شیکسپیر پر کچھ کہوں گا" اگر وہ خلوص اور دیانتداری سے کام لے تو اس کو کہنا پڑے گا کہ "میں آج آپ کو بتاؤں گا کہ میرا تعلق شیکسپیر یا ملٹن سے کیا ہے" اس قسم کی تنقید کسی فنی شہ پارے کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز

ہونے میں سہولت بہم پہونچانے، اس کے محاسن اور معائب پر ایک تبصرہ ہونے کی بجائے، ناقد کے احساسات و رجحانات کو منعکس کرتی ہے اور قاری کی توجہ کو اصلی فنی شہ پارے سے ہٹا کر ناقد کے احساسات و میلانات کی طرف مبذول کرلیتی ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات انگریزی کے پروفیسر رچارڈس نے تنقید میں ایک بالکل نیا تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی آنرز کے طالبعلموں کی ایک جماعت کو بعض نظمیں دیں اور اُن سے کہا گیا کہ وہ ان نظموں پر آزادانہ تبصرہ کریں۔ جو نظمیں منتخب کی گئی تھیں وہ طرز و خیال کے لحاظ سے تنوع کی حامل تھیں اور شیکسپیر جیسے مشہور و معروف شاعر سے لیکر وھیلہ جیسے گمنام شاعر کی نظمیں بھی شامل تھیں۔ ان نظموں کے نہ عنوانات دئے گئے تھے اور نہ کسی نظم کے نیچے شاعر کا نام لکھا ہوا تھا تاکہ وہ شاعر کے نام و شہرت کی طرف نہیں بلکہ کلام کی طرف دیکھیں، طالب العلموں کی جس جماعت کو یہ نظمیں دی گئیں، ان کی علمی و ادبی قابلیت پر رچرڈس کو پورا اعتماد ہے۔ وہ ایک ایسے تعلیمی ماحول کے آوردہ و پروردہ تھے جسے ملک کے تعلیمی اداروں میں بہترین کہا جاسکتا ہے رچرڈس کے یہ جمع کردہ مسودات، فن کو سمجھنے اور اس پر حکم لگانے کی دقتوں پر فن نقد کی تاریخ کے نہایت اہم دستاویزات ہیں اور نقد و انتقاد کے بعض نہایت اہم مسائل کو پیش کرتے ہیں۔

رچرڈس نے اِن مسودات کو مطالعہ کرنے کے بعد اُن سے جو نتائج اخذ کئے ہیں، ان کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصّہ وہ ہے جس میں اس نے مبصروں کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے اور مسودات کا حوالہ دیکر بتایا ہے کہ کس طرح ایک ناقد ادبی شہ پارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں اپنے تعصبات اور میلانات کا شکار ہوکر رہ جاتا ہے۔

جذباتیت (Sentimentality) تعصبات و عقائد وغیرہ مختلف چیزیں جن میں ایک ناقد اُلجھ کر رہ جاتا ہے کسی فنی شہ پارہ کو جانچنے میں معیاروں کے فقدان کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا یہ سوال کہ ہم کس چیز پر حکم لگا رہے ہیں۔

اختلاف رائے ضروری ہے اور ایک حد تک پسندیدہ بھی لیکن ایسے اختلافات جو اُن عناصر کو بالکل نظر انداز کردیتے ہیں جو ایک ادبی شہ پارہ کی تشکیل میں تانے بانے کی حیثیت رکھتے ہیں، درست نہیں۔

ادب اور زندگی ایک مرکب کے دو عناصر ہیں۔ ہمارے روزانہ کے حقیقی تجربات کو زندگی کے نام سے موسوم کیا گیا اور حقیقت سے گریز کرکے عجیب و غریب تخیلات میں پناہ لینے کو ادب کہا گیا۔ ان دونوں کے آپس کے تعلق سے کسی کو انکار نہیں لیکن کس حد تک یہ تعلق صحیح ہے اور کس حد تک غلط یہ نہایت ہی مشکل سوال ہے۔ ایک طرف زندگی کی آن ہے اور دوسری طرف ادب کی شان اِن دونوں کو آپس میں سمونا ہر ادیب کے

بس کی بات نہیں اور یہی "سمونا" ادبی قدر و قیمت کا میزان ہے۔

تنقید کا سب سے پہلا قدم "ابلاغ" (Communication) ہے یعنی فنکار کے مفہوم اور اس کے جذبات کو صحیح طور پر سمجھنا۔ جب ہم فنکار کے تجربہ پر قابو پا لیتے ہیں تو بعد میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اکثر و بیشتر قدر و قیمت کا اندازہ لگانا تو درکنار ناقد فنکار کے مفہوم تک ہی پہونچنے نہیں پاتا، اس کے مختلف وجوہ ہو سکتے ہیں۔ کبھی ناقد کے تعصبات اور اس کے ذاتی رجحانات حائل ہوتے ہیں اور کبھی "ابہام" مانع آتا ہے۔

رچرڈس کی تنقید کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں اس نے اپنی عملی تنقید کے تجربات کی بنا پر بعض تجویزیں پیش کی ہیں۔ جو فنی شہ پاروں کو سمجھنے اور سمجھانے میں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔ رچرڈس کی تنقید کا اہم حصہ یہی ہے اور ہم اس پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ فنکار کے احساسات اور اس کے مفہوم کو صحیح طور پر تفہیم کی گرفت میں لانا ہی ایک ایسا سخت مرحلہ ہے جس سے ہم آسانی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ فنکار ایک مداری ہے جو الفاظ کی شعبدہ گری سے اپنے مختلف احساسات و جذبات کا جلوہ دکھاتا ہے۔ اس کے ہر اشارہ میں ایک نئی بات اور ایک نیا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ہم فنکار کے مرکزی خیال یا نقطہ تک پہونچنے میں اُن ہلکے خطوط کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو مرکزی نقطہ کی تکوین کے ناگزیر عناصر ہیں۔

زبان — اور خصوصاً وہ زبان جس کا تعلق ادب سے ہے بیک وقت مختلف فرائض کو انجام دیتی ہے اور نقد و انتقاد کی دقتوں کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم زبان کے مختلف وظائف کے باہمی فرق کو ملحوظ خاطر نہ رکھیں۔

رچرڈس نے نطق انسانی کو مفہوم کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) بیانیہ — جس میں بعض اُمور، حالات یا واقعات کی طرف سامع کی توجہ کو مبذول کیا جاتا ہے جو اُسے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمریوں ہی تمام ہوتی ہے

(۲) احساساتی — ان بیانات یا واقعات کے متعلق فنکار کے احساسات بھی ہوتے ہیں، اس کا ایک انفرادی انداز نظر بھی۔ کسی خاص پہلو سے اُسے دلچسپی ہوتی ہے اور کسی پہلو کو وہ خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس قسم کے مفہوم کو ہم سہولت کے لئے "احساساتی" کہیں گے، مثلاً یہ شعر:

دی موذن نے اذاں وصل کی شب پچھلی رات ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

پہلا مصرعہ محض بیانیہ ہے دوسرے میں شاعر نے اس واقعہ کے متعلق اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے — یا

غالب کا یہ شعر :-

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا، کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

(۳) لہجہ — سامعین کی طرف متکلم کا ایک خاص رجحان ہوتا ہے۔ سامعین کے جس طبقہ کے سامنے وہ گفتگو کرتا ہے اس کے تغیر و تبدل کے پیش نظر وہ اپنے الفاظ اور طرزِ گفتگو میں ترمیم و اضافہ کرتا ہے۔ اس کے خطاب اور گفتگو کا لہجہ اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو متکلم اور اس کے سامعین کے درمیان قایم ہوتا ہے اس کی اچھی مثالیں ہمیں فنِ خطابت میں ملیں گی۔

(۴) مقصد — فنکار یا متکلم — جو کچھ کہتا ہے، جس احساس کے ساتھ کہتا ہے اور جس لہجہ میں کہتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اس کا ایک مقصد بھی ہوتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ ایک اثر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جب تک کہ ہم کو اس کے مقصد کا علم نہیں ہوتا ہم اس کی کامیابی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

اگر ہم زبان کے استعمال کا جایزہ لیں تو مفہوم کے یہ چاروں اقسام ملیں گے لیکن کسی میں "بیانیہ" مفہوم کا عنصر زیادہ ہوگا، تو کسی میں "احساساتی" مفہوم کا پلہ بھاری ہوگا۔ مثلاً سائنس کے کسی موضوع پر مقالہ لکھنے والا محض اپنے تجربات، مشاہدات یا واقعات کو بیان کرے گا۔ مفہوم کے لحاظ سے اس کا مقالہ "بیانیہ" ہوگا۔ وہ اپنے احساسات کو ان بیانات سے ملوث نہ ہونے دے گا۔ اس کے دلائل میں احساسات کی آمیزش نہ ہوگی اور قارئین کو جو کچھ بھی احساسات کی جھلک ملے گی وہ اس کے مشاہدات کے ماتحت ہوگی۔ "لہجہ" میں وہ اس قسم کی علمی روایتوں کی پابندی کرے گا اور اس کا مقصد صرف یہی ہوگا کہ اس کو جو کچھ بھی کہنا ہے اُسے نہایت صاف اور صریح الفاظ میں بیان کیا جائے تاکہ پڑھنے والے کے لئے اس میں کوئی گنجلک نہ رہے۔ اگر ہم کسی سیاسی تقریر کو لیں اور اس کا تجزیہ کریں تو مفہوم کے لحاظ سے سب سے اہم مقرر کا "مقصد" ہوگا اور مقصد کے حصول کے آلۂ کار ایک طرف "احساسات" ہوں گے اور دوسری طرف اس کا "لہجہ"، جو سامعین کے ساتھ ایک سازگار فضا قایم کرنے میں ممد و معاون ہوں گے۔ اس میں 'حقیقت و بیان' کا نمبر سب سے آخری ہوگا، بلکہ اکثر و بیشتر غائب ہی رہے گا۔

مفہوم کے ان چار اقسام — (۱) بیانیہ، (۲) احساساتی۔ (۳) لہجہ۔ (۴) مقصد — کا تجزیہ کرنا اور ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرنا آسان کام نہیں بلکہ بعض اوقات ان کے درمیانی فرق کو بیان کرنا ہی تقریباً ناممکن نظر آتا ہے اس کے علاوہ مفہوم کے یہ چار اقسام ایک بڑی حد تک ایک دوسرے سے میل بھی کھاتے ہیں اور آپس میں اس حد تک ملے جلے ہوتے ہیں کہ ان کو آسانی سے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی شہ پاروں میں فنکارانہ چابکدستی کی ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی جن کا انداز بظاہر ہوتا کچھ ہے لیکن اس سے جو اثر مترتب ہوتا ہے وہ کچھ اور۔

رچرڈس نے مسودات کے مطالعہ میں جس چیز کا فقدان پایا وہ یہی تھا کہ اس کے مبصرین مفہوم کے ان چار اقسام کو تفہیم کی گرفت میں نہ لا سکے۔ کہیں فنکار کے احساسات کو توڑ مڑوڑ دیا گیا تو کہیں اس کے "لہجہ" کو کچھ کا کچھ سمجھ لیا گیا اور کہیں مقصد کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہم نے پہلے ہی یہ تسلیم کر لیا ہے کہ مفہوم کے یہ چار اقسام ایک بڑی حد تک ایک دوسرے سے میل کھاتے ہیں اور اکثر و بیشتر اس حد تک آپس میں ملے جلے ہوتے ہیں کہ ان کو آسانی سے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ "خیال" کیا ہے "احساس" کیا ہے۔ "مقصد" اور "لہجہ" کو کس طرح الگ کیا جا سکتا ہے، ان سوالوں کا جواب دینا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ہمارے دل و دماغ میں ایسی صلاحیت کا پیدا کرنا کہ وہ ان چاروں مفہوموں کو بغیر کسی اُلجھاؤ کے سمجھ سکے۔

مفہوم کے لحاظ سے رچرڈس کی یہ نئی تقسیم نقد و انتقاد کے حربوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور فنی شہ پاروں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مفید ثابت ہوگی۔

میں نے اب تک رچرڈس کے نظریہ کو بیان کیا اور حتی الامکان اُردو ادب سے مثالیں دیکر اس کے نظریہ کی وضاحت کی۔ رچرڈس نے مفہوم کے جو چار اقسام بتائے ہیں اور اس کی جو وضاحت کی ہے، اس سے مجھے پورا اتفاق نہیں۔ میں اس کی وضاحت میں ایک خفیف سی ترمیم ضروری سمجھتا ہوں۔

رچرڈس نے مفہوم کے مختلف پہلوؤں میں ایک اہم پہلو کو جسے میں سب سے اہم سمجھتا ہوں، نظر انداز کر دیا ہے۔ نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے پڑھنے والوں کو اس کی اہمیت کا پورا احساس نہیں دلایا۔

"لہجہ" کو رچرڈس نے مفہوم کی تیسری قسم بتائی ہے۔ 'لہجہ' سے اس کی مراد متکلم کا لہجہ ہے یا بالفاظ دیگر سامعین سے اس کا اندازِ گفتگو ہے۔ لہجہ کے اُتار چڑھاؤ اور انداز خطابت کے تعین کا انحصار اس رشتہ پر ہے جو متکلم اور سامعین کے درمیان قایم ہوتا ہے۔ کسی سیاسی تقریر کے تجزیہ میں تفہیم کا یہ پہلو بیشک نہایت اہم ہے لیکن ادب میں اس قسم کے لہجہ کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ اس کی کوئی اہمیت۔ ایک فنی شہ پارے کی تخلیق کے بعد اسکی بقا کے لئے ابلاغ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن جہاں تک فنکار کا تعلق ہے فن کی تخلیق کے وقت اس کے ذہن میں غیر شعوری طور پر اس کے سامعین یا قارئین کا خیال شاید ہو، لیکن بظاہر وہ ان کے وجود سے غافل ہوتا ہے۔ اگر فنکار شعوری طور پر اپنے قارئین کو پیش نظر رکھے تو اس کے آرٹ میں تبلیغ کا عنصر زیادہ ہو جائے گا اور اس کا آرٹ اپنی پُر پیچ بلندیوں پر پہونچنے میں ناکام رہے گا۔ ایک اعلیٰ درجہ کا فنکار ہمیشہ اپنے قارئین کے وجود سے تجاہل برتے گا اس کی تمام توجہ کا مرکز اس کا مواد ہوگا، اس مواد کے متعلق اس کے احساسات ہوں گے اور اس کا اپنا ایک اندازِ نظر۔ وہ اپنے مواد کو ترتیب دینے کے بعد ایک خاص زاویہ سے اس پر نظر ڈالنا پسند کرے گا اسی کو ہم اس کا "لہجہ" یا اس کا "اندازِ نظر" کہیں گے۔ رچرڈس نے اس "اندازِ نظر" (یا لہجہ) کو احساسات میں شامل کر دیا ہے۔

اب مفہوم کے چار اقسام کی نئی تشکیل حسب ذیل ہوگی :-

(۱) "بیانیہ" - یعنی مواد کا انتخاب اور مواد کی ترتیب، بعض حالات یا واقعات کا بیان، جس کی طرف سامع یا قاری کی توجہ کو مبذول کیا جاتا ہے۔

(۲) "احساساتی" یعنی فنکار کے منتخب کردہ مواد، خیالات یا واقعات کے متعلق اس کے احساسات۔

(۳) لہجہ یعنی وہ کس نقطۂ نظر سے اس واقعہ یا مواد کو دیکھتا ہے واقعہ کے کس پہلو کو وہ اہمیت دیتا ہے اور کیوں ؟

(۴) "مقصد" نمبر (۱) یا نمبر (۳) ہی میں فنکار کا مقصد بھی شامل ہے لیکن "افادی ادب" میں تفہیم کا یہ پہلو ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہم اس کو ایک جداگانہ حیثیت دیں گے۔

نمبر (۱) نمبر (۲) اور (۴) پر پچھلے صفحات میں بحث ہو چکی ہے اب نمبر (۳) - لہجہ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ فنکار سماج کی ایک فرد ہے وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی - وہ اپنے سماجی ماحول سے مواد لیتا ہے اور اس کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ کبھی، سماج کے ایک خاص حصہ سے مواد کا انتخاب ہی فنکار کے لہجہ اور مقصد کا اعلان ہوتا ہے اور کبھی فنکار کا ایک آدھ لفظ یا جملہ اس کے لہجہ کا اشاریہ ہوتا ہے۔

نقد و انتقاد کی عمارت دو ستونوں پر کھڑی ہوئی ہے :-

(۱) ابلاغ اور (۲) اندازۂ قیمت یعنی فنکار کے خیالات، اس کے احساسات، اس کے لہجہ اور اس کے مقصد کو صحیح طور پر تفہیم کی گرفت میں لانا اور اس کے بعد اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا۔

عبدالقادر ام - اے

ملک خطا کے شاہزادے

سید وصی احمد بلگرامی فانی بی - اے کا یہ وہ معرکۃ الآرا مقالہ ہے کہ جسوقت یہ ۱۹۲۳ء میں نگار میں شایع ہوا تو ملک میں ہلچل مچگئی اور نہ صرف ادب و انشا، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کا زبردست خیر مقدم کیا گیا، اس مقالہ پر اڈیٹر نگار نے تبصرہ بھی شایع کیا تھا۔ اب یہ مقالہ معہ تبصرہ کے کتابی صورت میں شایع ہوا ہے۔ قیمت علاوہ محصول بارہ آنے۔

مینجر نگار

رجب علی بیگ سرور کے خطوط

اُردو ادب، کے نئے ادیب و نقاد جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب کا ایک مضمون "مکاتیب رجب علی بیگ سرور" نگار نومبر ۱۹۴۲ء میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کا مقصد مکاتیب سرور پر کچھ لکھنے کا نہ تھا بلکہ وہ ایک کتاب "تاریخ مکاتیب اُردو" مرتب کر رہے ہیں جس کے سلسلہ میں سرور کا ذکر کرنا ناگزیر تھا انھوں نے اسی مقصد کے ماتحت یہ مضمون لکھا اور اس کو بہت کچھ تشنہ چھوڑ دیا۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو مکتوب نگاری کے سلسلہ میں سرور کا نام سرفہرست آنا چاہئے کیونکہ سرور نے بے خبر اور غالب سے قبل مکتوب نگاری شروع کر دی تھی۔ سب سے آخر میں سرور کے "اسلوب نگارش" پر تنقید کی ہے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا یہ مضمون تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی ادبی و تنقیدی حیثیت بالکل نہیں۔ اس مضمون نے سرور کے "اسلوب نگارش" پر ایک اور پردہ ڈال دیا۔

ان کی پوری تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔ مکاتیب سرور کا اسلوب نگارش سطر سطر میں تصنع۔ ساختگی۔ قافیہ پیمائی۔ رنگین بیانی۔ مبالغہ نگاری اور رعایت لفظی کو لئے ہوئے ہے جو صحیح نہیں ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی تنقید کی عمارت "انشائے سرور" کے پہلے اور دوسرے حصہ کے بل پر قایم کی ہے۔ انھوں نے تنقید کرتے وقت مرزا کی "عرضیوں" اور "واجد علی شاہ" کے خطوط پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور کتاب کے تیسرے حصہ کو ایک دم تک پس پشت ڈال دیا ہے۔

سرور کے مکاتیب تین حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:۔

وہ خطوط جو سرور نے واجد علی شاہ اختر کے نام لکھے۔ وہ خطوط جو سرور نے اپنے احباب کو لکھے۔

وہ خطوط جو سرور نے اپنے بیٹے احمد علی صاحب کو لکھے۔

واجد علی شاہ، لکھنؤ کے بادشاہ ہی نہ تھے بلکہ ایک شاعر اور ادیب بھی تھے لکھنؤ کا معمولی سے معمولی انسان صاف و سادہ زبان میں گفتگو کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ ان کی زبان اور طرز معاشرت بالکل جدا تھی۔ وہ الفاظ کی بازیگری۔ مبالغہ اور تکلف کی آمیزش اور رنگین فقروں اور جملوں پر جان دیتے تھے اس لئے سرور کے ان مکاتیب کا بھی وہی رنگ تحریر ہے جو واجد علی شاہ کو محبوب تھا۔

"دوستوں کے خطوط"، کسی مکتوب نگار کا گراں بہا سرمایہ سمجھے جاتے ہیں اور اکثر خطوط سے وہی خطوط مراد لئے جاتے ہیں جو مکتوب نگار اپنے بے تکلف دوستوں کو لکھتا ہے۔ حفظ مراتب کا خیال ختم ہو جاتا ہے تکلف کا پردہ اُٹھ جاتا ہے مراسلہ کو مکالمہ اور مکالمہ کو مراسلہ بنا دیا جاتا ہے انہیں خطوط میں مکتوب نگار بے تکلف باتیں اور بے لاگ تنقیدیں کرتا ہے۔ شوخی، شرارت، چھیڑ چھاڑ انھیں خطوط کی جان ہوتی ہے۔ سینہ کے مدفون راز زبان قلم پر آجاتے ہیں اور اکثر ایسی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں کہ دُنیا دنگ رہ جاتی ہے۔

سرور کے خطوط دوستوں کے نام اتنے کم ہیں کہ ان پر محاکمہ کرنا سخت مشکل ہے۔ پھر بھی ان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دوستوں کے خطوط کی جان کہلاتی ہیں۔ یہ کل بارہ خطوط ہیں۔ ان میں واجد علی شاہ کے خطوط کی طرح الفاظ کی بازی گری نہیں۔ یہ حصہ تصنع و تکلف سے بھی پاک ہے۔ ان میں سرور نے اپنی جولانی طبع کے جوہر نہیں دکھائے ہیں بلکہ کھل کر اپنے راز کہے ہیں۔ اپنی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے۔ تنگ دستی اور بے سروسامانی کا حال لکھا ہے۔ واجد علی شاہ کے قید ہو جانے کے حالات بتائے ہیں۔ لکھنؤ کی تباہی اور بربادی پر آنسو بہائے ہیں۔ اس زمانہ کے "فسادات" کا تذکرہ کیا ہے۔ غرض کہ سرور کی زندگی کے جتنے حالات و واقعات ہمیں ان خطوط سے ملتے ہیں وہ دوسرے خطوط سے نہیں۔ ان میں اکثر باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان بارہ خطوط میں چار خطوط ایسے بھی ہیں جو سرور نے بغیر القاب و آداب کی بندشوں کے بے تکلف لکھے ہیں۔ چونکہ سرور کی ابتدائی عمر کے خطوط اس مجموعہ میں نہیں ہیں اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ مکاتیب کو القاب و آداب کے پر تکلف قید و بند سے آزاد کرنے کا سہرا۔ سرور کے سر ہے یا غالب کے۔ بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ غالب کو جس حیثیت سے موجد و منفرد ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے اس میں تھوڑا سا حصہ سرور کا بھی ہے۔ دہلی اسکول کی نمایاں خصوصیت اس کی معنی آفرینی رہی ہے لیکن لکھنؤ ہمیشہ سے الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنسا رہا۔ لکھنؤ کی سرزمین پر رہتے ہوئے اور اپنے زمانہ اور طرز کے بہترین مصنف ہونے کے باوجود سرور کا القاب و آداب کی بندشوں کو توڑ دینا واقعی بڑے تعجب کی بات ہے اور اسی وجہ سے غالب کا القاب و آداب کو حذف کر دینا اتنا قابل ستایش نہیں جتنا سرور کا اس نئی روش کو اختیار کرنا ہو سکتا ہے۔ ایک خط وہ اس طرح شروع کرتے ہیں

"یادم نمی کنی و زیادم نمی روی،
عمرت دراز باد فراموش کار من

سبحان اللہ بجدہ ہمیں بیکاری سے سابقہ ہوا۔ روزگار جائے کسی کو خیال نہ آئے"

دوسرا خط اس طرح لکھتے ہیں:

"جناب والا بندگی عرض کرتا ہوں عنایت نامہ آیا"

تیسرے خط کا انداز یہ ہے :-

"قبلہ بندہ بندگی، تین ماہ بعد عنایت نامہ آیا"

چوتھے خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں :

"قبلہ بندہ - تسلیم بجالاتا ہوں"

چاروں خطوط کی ابتدا کرنے کا انداز جداگانہ ہے - اس سے ان کی تنوع فطرت کا پتہ چلتا ہے - صاف ظاہر ہے کہ یہ خطوط سرور نے اپنے انتہائی بے تکلف دوستوں کو لکھے ہیں اور اس بے تکلفی میں القاب و آداب کا وہ فرسودہ طریقہ جو خود ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا پس پشت ڈال دیا ہے -

سرور کے یہ خطوط تکلف اور تصنع سے اتنے آلودہ نہیں کہ ان کا پڑھنا بار ہو جائے - حسب عادت کہیں کہیں ان کا قلم بہک جاتا ہے اور وہ ایسی بے سروپا باتیں کرنے لگتے ہیں کہ ہنسی آجاتی ہے - ایک دوست نے گرمی کا حال پوچھا، اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

"اگر فی الجملہ یہاں کا مذکور ہو - زبان میں چھالے پڑیں - بات کرنے کے لالے پڑیں، سوا نیزے پر آفتاب ہے - جو جانور اُڑا کباب ہے - دن کو بے مہری سے آفتاب جلاتا ہے - راتوں کو تارے انگارے ہیں - چاند پر سورج کا شبہ ہوتا ہے - جو بشر ہے پانی کا جانور ہے - پروانوں کے ہوش چلتے ہیں - شمع کی صورت خاموش جلتے ہیں، ہوا اس طرح شرر بار ہے جو گھر ہے کرۂ نار ہے - طوطی حق اللہ بھولی - زبان پر پانی پانی ہے، ایسی حرارت کی طغیانی ہے مرزا صاحب کی محبت خط لکھواتی ہے ورنہ آجکل دوات بھٹی ہے - قلم کی زبان جلی جاتی ہے"

لیکن یہ اور دو ایک جگہ کے علاوہ باقی خطوط اس قسم کی بے جا طوالت سے آزاد ہیں نہ ان میں مبالغہ ہے نہ مضمون آفرینی - قافیہ جگہ جگہ نظر آتا ہے لیکن سامعہ پر گراں نہیں گزرتا - اکثر خطوط میں شوخی، شرارت، بے تکلفی اور رازدارانہ باتیں پائی جاتی ہیں - وہ بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اور بعض جگہ تو ظرافت کے ایسے موتی بکھیر جاتے ہیں کہ طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے - ایک خط میں لکھتے ہیں :

"قبلہ بندہ - تسلیم بجالاتا ہوں - جو کام نیا کرتا ہوں اس کی داد پاتا ہوں - آپ کی پوسٹ ماسٹر صاحب تک رسائی ہے، میں نے ہرکاروں سے رسم بڑھائی ہے - گو ہم پلہ نہیں کم ہوں لیکن قدم بہ قدم ہوں، آپ سا قدر داں مجھ سا پیرو جانفشاں اور فلک تفرقہ پرداز اپنی عادت بدلے، دو ایک جا ہو جائیں - عجیب لطف ہو بڑے تماشے نظر آئیں"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

"کیوں حضرت - ہم کیا پوچھتے ہیں - آپ کیا فرماتے ہیں - منضج کا حال - مسہل کا مآل - پھنسی پھوڑوں کا احوال

تو نہ لکھا - ہندو مسلمان کا بکھیڑا چھیڑا - بندے کو دونوں سے سروکار نہیں - متہم اخبار نہیں - فقط ارشاد بجالاتا ہوں"
اس کے بعد فساد کا مفصل ذکر کرتے ہیں اور اس بے تکلف اور شوخ جملہ پر ختم کرتے ہیں -

"لکھنؤ کا تبرا دور - دور مشہور ہے - آج کل مجلسوں میں یا عیدین کو مسجدوں میں جہاں شیعہ، سنی جماعت ہوتی ہے - حاکم شام کے بدلے ناظم فیض آباد اور حاکم سلطان پور پر لعنت ہوتی ہے"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"میر مکرم علی صاحب سے کہئے - آپ نے ہم کو یاد نہ کیا غضب کیا، پروردگار دونوں صاحبوں کو بہ صحت وسلامت رکھے - بشر پیچر سے سخت تر ہے - اس کا حوصلہ بہت بڑا ہے - مشہور ہے بے جگر ہے - جو افتاد پڑتی ہے جھیل جاتا ہے - رفتہ رفتہ مذکور رہ جاتا ہے"

کسی صاحب نے سرور کو لکھا کہ میں نے جواب دیا تھا شاید آپ کو نہیں ملا - اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں -

"وہ جو جواب خط کا حال ہے - اس کی صورت یہ ہے کہ اگر روانہ ہوتا تو آتا وگرنہ سرکارہ بیچارہ کیا لاتا"

ان کے ایک دوست مسہل لے رہے تھے - ان کو لکھا ہے :-

"مسہل سے زیادہ مصیبت دنیا میں اور نہیں - اس کا بھگونا - بنانا اور پینا - کیا ستم وجور نہیں - جوانی کا قضیہ بڑھاپے میں فیصلہ ہوتا ہے"

اگر ان مکاتیب کو بھی سطر سطر میں - تصنع - تکلف - مبالغہ اور رعایت لفظی سے بھرا ہوا کہا جائے تو سرور کی طرز تحریر پر صریحاً ظلم کرنا ہے - ان میں سوائے قافیہ کے کوئی لکھنوی خصوصیت مشکل سے نظر آتی ہے جنے ان کے نفس مضمون کو خبط نہیں کر دیا ہے بلکہ ان کی طرز نگارش کو اور نکھار دیا ہے - اس کی تفصیل آگے آئے گی -

احمد علی صاحب کے نام کے خطوط سرور کی مکتوب نگاری کی جان کہے جا سکتے ہیں - یہ ترتیب وار ہمارے سامنے ہیں اور ان کی تعداد دیگر مکتوبات سے بہت زیادہ ہے - جس کے ذریعہ مکتوب نگار کے طرز تحریر وغیرہ متعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے -

دوسرے یہ خطوط سرور کی زندگی اور خانگی واقعات کا آئینہ ہیں - دوست کتنا ہی بے تکلف کیوں نہ ہو - لیکن اپنی یا اپنے خاندان کی کمزوریاں یا بے سروسامانیوں کا اس سے تذکرہ کرتے ہوئے ہم کو تامل ہوتا ہے - ہم اس کا اظہار کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے - مگر جب کبھی اپنے خاندان کے کسی فرد سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کے سامنے ان تمام باتوں کا ذکر کر کے دل کا غبار نکال لیتے ہیں اور اس طرح ہماری طبیعت بہت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے - یہی حالت سرور کے ان خطوط کی ہے - وہ اپنی پریشانی اور بے سروسامانی ہی کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اپنے اعزا اور رفقار کے ساتھ ہمدردیاں اور احسانات کرنے کا بھی ذکر کرتے ہیں - دوسروں کی بیوفائی اور اپنی

وفاداری کا حال بیان کرتے ہیں۔ غرضکہ سرور کی فطرت۔ عادت۔ خلوص محبت، ہمدردی۔ ایثار وغیرہ کے متعلق ہمیں بہت سی معلومات ان خطوط سے حاصل ہوتی ہیں جو دوستوں کے خطوط سے ممکن نہ تھیں۔

تیسری خصوصیت ان خطوط کا طرز تحریر ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ یہاں سرور بہ حیثیت "مصنف فسانۂ عجائب" کے نظر نہیں آتے بلکہ وہ ایک باپ ہیں جو اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ یہاں مبالغہ اور تکلف نہیں بلکہ راز دل اور حال دل کہنا مقصود ہے۔ یہاں وہ اپنی مفروضہ شخصیت کو بھول جاتے ہیں اور ایک محبت کرنے والے دل کی طرح ان کے منہ سے بھی آہ نکل جاتی ہے۔

میں نے احباب کے خطوط کے سلسلہ میں کہا تھا کہ وہ تصنع اور تکلف سے کسی حد تک پاک ہیں۔ البتہ قافیے کی پابندی کا خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن ان خطوط میں۔ تصنع۔ تکلف۔ مبالغہ۔ رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ قافیہ بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اگر عادتاً کوئی مقفیٰ لفظ آگیا تو آگیا۔ لیکن وہ اس کی پابندی کی فکر نہیں کرتے۔ ان کی زبان بالکل صاف و سادہ ہے۔ شوخی بھی کہیں کہیں اپنے جلوے دکھاتی ہے اور مرزا غالب کا ہلکا سا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

"بعد دعا اور دیکھنے کی تمنا کے مدعا طراز ہوں۔ الحمد للہ والمنت خط فرحت نمط بعد از عرصۂ بعید۔ انیسویں پنجشنبہ کا لکھا۔ یکشنبہ کو آیا۔ مگر عجیب اتفاق ہے جمادی الثانی کا لکھا جمادی الاول کو ہمارے پاس آیا۔ یہ فقط ہمارا فرط شوق تھا کہ مہینہ بھر پہلے ہم کو ملا۔ تمہاری طبیعت کی بدمزگی اس سے اور زیادہ ثابت ہوئی۔ خط آنے کی خوشی بھول گئے۔"

بے تکلفی کی ایک مثال دیکھئے۔ بیٹے کو لکھتے ہیں:۔

"ہاں بھائی ایک دوا ہاتھ آئی ہے۔ اکثر تجربہ ہوا کبھی خطا نہیں ہوئی، دو گھڑی بخار کی آمد سے پہلے بتاشے میں مونگ برابر رکھ کر کھا جانا۔ اللہ چاہے تو پھر منہ نہ دکھائے۔ محمد حسین خاں بیٹھے ہیں، تمہارے خط نہ لکھنے کی شکایت وہ بھی کرتے ہیں کہ لکھتے لکھتے ہاتھ گھس گئے جواب نہ بھیجا۔ صادق علی خاں چابک سوار سرکاری تمہارا ذکر کرتے تھے کہ مجھے مکان پر لے گئے حقہ پان وغیرہ سے مسافر پروری کی۔ برخوردار واجد علی کو ہمارا سلام کہنا۔"

ذرا اس خط کی طرز نگارش کو دیکھئے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا کوئی خط پڑھ رہے ہیں:

"خط تمہارا عرصۂ بعید کے بعد چوتھی کا لکھا دسویں کو آیا۔ اینہم غنیمت است۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد بھی اگر یاد کرو خیریت ہے۔ حال ان کی طبیعت کا کھلا۔ غضب کی جا ہے۔ کبھی مسہل میں بیس دست کسی کو آتے ہیں فقط مادہ کی کثرت تھی۔ اگر رہتا تو ذرا جانے کیا فساد پیدا کرتا۔ اب جو کیفیت مزاج کی ہو مفصل لکھو۔

کیا کہیں جیسا قلق ہم کو پناہ علی صاحب کے مرنے کا ہے۔ خدا خوب جانتا ہے۔ بے مثل آدمی مر گیا"

مندرجہ بالا فقرے اور جملے محض سیدھی سادی زبان میں مطلب ہی ادا نہیں کرتے بلکہ ان میں جو جان پائی جاتی ہے اس سے اہل نظر غافل نہیں یہی طرز تحریر اکثر مقامات پر سرور کو غالب سے قریب تر کر دیتی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"میاں نبو اور مرزا مغل جان لکھتے ہیں کہ میں بازار میں جاتا تھا۔ ایک بزرگوار نے فرمایا۔ تم نے کچھ سنا۔ رجب علی بیگ بنارس سے اپنے بیٹے کی ملاقات کو کانپور آئے۔ وہ فتحپور کے کوتوال ہو گئے تھے کانپور میں نہ ملے جب انھوں نے قصد فتحپور کا کیا وہ دفعتاً سفر کر گئے۔ دنیا سے گزر گئے۔ اس خبر سے عجیب حال ہوا جس سے سلامفصل کیفیت نہ کھلی بلکہ مولوی یعقوب صاحب بھی اسی صدمہ میں مبتلا تھے۔ للہ الحمد تمھاری خبر پائی جان میں جان آئی۔ اور تمھارے روزگار کی بھی خوشی ہوئی، خط نہ لکھنے کا رنج رہا"

ایک جگہ یہ بے تکلف جملے اپنے متعلق لکھتے ہیں:-

"اور بھائی سنو۔ ہمارے جینے کا اب اعتبار نہیں، بشر کا اختیار نہیں۔ حال روز بروز بدتر ہوتا جاتا ہے ابھی کچھ گیا کچھ جاتا رہا۔ لکھنؤ میں بھی وبا کا بڑا زور شور ہے۔ ہر ایک زندہ درگور ہے"

کہیں کہیں وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرنے لگتے ہیں اور ایسے لطیف نکتہ بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"حرص کی دنیا مثل ریشم کے کیڑے کے ہے جس قدر جمع کرتا ہے اس کے اندر آخر کو گھٹ گھٹ کر مرتا ہے"

"اور بھائی تعجیل کا انجام پشیمانی ہے کبر و غرور کا انجام دشمنی ہے"

ایک مختصر سا خط پیش کرتا ہوں تاکہ ان کے پورے خط لکھنے کا انداز معلوم ہو سکے:

"بعد دعائے نیم شبی اور وظیفہ سحری مطالعہ ہو۔ تاریخ آٹھویں اور روز جمعہ کا تھا۔ صبح سے زبان سے بات ساتھ لکنت کے نکلنے لگی۔ اس باعث طبیعت بہت پریشان ہوئی۔ بہر دن چڑھے حکیم میر وارث علی صاحب کو بلا کر دکھایا۔ انھوں نے لقوہ تجویز فرمایا۔ اس وقت سے علاج ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کہتے ہیں۔ خاطر جمع رکھو۔ انشاءاللہ تعالیٰ بہت جلد افاقہ ہو جائے گا۔ لہذا بہ مجرد دیکھنے اس خط کے اس طرف روانہ ہو۔ ہمارا تمھیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ زیست کا اعتبار نہیں۔ بشر کا اختیار نہیں"۔

ان اقتباسات سے سرور کا طرز نگارش صاف جھلکتا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مکتوب نگار سرور کا کوئی درجہ متعین کرنا اور ان کے خطوط کی صحیح قدر قیمت کا اندازہ لگانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم ان کے ماحول اور زمانہ کا جائزہ نہ لیں اور دوسرے مکتوب نگاروں سے ان کا موازنہ و مقابلہ نہ کریں۔

سرور کی مکتوب نگاری اس عہد کی پیداوار ہے جب غالب اپنے مکاتیب کو فارسی سے آزاد کر کے اُردو مکتوب نگاری میں ایک طرز خاص کی داغ بیل ڈال رہے تھے، سرور، غالب سے دس سال بڑے تھے۔ لیکن انکے ابتدائی زمانہ کے خطوط نہیں ملتے۔ صرف آخری ایام کے چند خطوط ہیں جو انھوں نے واجد علی شاہ۔ اپنے احباب اور احمد علی صاحب کو لکھے ہیں۔ ان خطوط پر بہ استثنائے چند کوئی سنہ وغیرہ مرقوم نہیں لیکن ان کے پڑھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہ خطوط "نوائے سحری" کا حکم رکھتے ہیں۔ یعنی یہ خطوط سرور نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھے ہیں۔ غالب کی اُردو مکتوب نگاری کی تاریخ ۱۸۵۰ء مانی جاتی ہے۔ حالی نے "یادگار غالب" میں لکھا ہے کہ مرزا سنہ مذکور سے قبل فارسی میں مکتوب نویسی کیا کرتے تھے لیکن سنہ مذکور سے جب وہ ہمہ تن مہر نیمروز لکھنے میں مشغول ہو گئے تو انھوں نے اپنی آسانی کے لئے اُردو مکتوب نگاری شروع کر دی لیکن "لنگی والے" خط سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا نے ۱۸۵۰ء سے قبل اُردو میں خطوط لکھنا شروع کر دئے تھے۔ مگر اس سے اکثر ناقدین کو اختلاف ہے۔ بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ غالب نے ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۰ء میں اُردو مکتوب نگاری کی ابتدا کی۔ سرور کے ایک خط میں ۱۸۵۵ء اختتام پر درج ہے۔ لیکن یہ خط چند خطوط کے بعد لکھا ہوا ہے اور کتاب کی ترتیب بھی کہیں کہیں درست نہیں۔ اس وجہ سے یہ کہنا آسان نہیں کہ سرور نے سب سے پہلے کس سنہ میں خط لکھا۔ خواجہ صاحب نے ایک "عرضداشت" سے جسے کم از کم میں خط نہیں سمجھتا۔ یہ ثابت کیا ہے کہ سرور مرزا غالب اور بے خبر سے پہلے مکتوب نگاری شروع کر دی تھی۔ لیکن یہ ہر شخص ماننے کے لئے طیار ہو جائے گا کہ سرور نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں بھی خطوط لکھے ہوں گے اور ان کا سنہ تحریر یقیناً بے خبر اور غالب سے پہلے کا ہوگا۔ سرور کے متعلق ابھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے غالب سے پہلے خطوط لکھے تھے کہ نہیں لیکن چونکہ دونوں کے بہت سے خطوط ایک ہی سنہ میں لکھے گئے ہیں۔ اس وجہ سے دونوں کو بہ حیثیت ہم عصر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔

محمد حسین انور (مسلم یونیورسٹی)

مذہب اور فلسفۂ مذہب

ان دونوں میں پہلی کتاب اڈیٹر نگار کی تصنیف ہے، دوسری سید مقبول احمد بی، اے کی اور نظریۂ مذہب سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر ایک کی قیمت ایک روپیہ فی کاپی۔ دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک معاف۔

منیجر نگار لکھنؤ

تاریخ اودھ کا ایک دلچسپ ورق

(کنگلا محل)

شاہِ اودھ سلیمان جاہ نصیر الدین حیدرؒ اپنی حرم نواب قدسیہ محل کو بیحد چاہتے تھے، مگر جب انھوں نے کسی وجہ سے ۲۱ اگست ۱۸۳۴ء کو زہر کھا کر خودکشی کرلی تو بادشاہ کے اضطراب و بیچینی کی کوئی انتہا نہ رہی چنانچہ فرح بخش کی سکونت ترک کرکے کبھی دولتخانہ آصفی میں قیام کرتے کبھی کوٹھی دلکشا میں مگر طبیعت ہر دم افسردہ و ملول رہتی تھی۔ اور رفقاء و امراء اپنے اثر و رسوخ کے لئے شہر کی خاک چھاننے لگے کہ جہاں سے ہو مرحومہ کی شکل و شمایل کی کوئی عورت ڈھونڈھ نکالیں تاکہ بادشاہ کی اشک شوئی ہو اور قدسیہ محل کا غم دور ہو سکے۔

شروع میں بادشاہ نے خیال کیا کہ قدسیہ محل کی ایک چھوٹی بہن نازک ادا نامی اور بھی ہے جو نواب دولہا کو منسوب ہے چونکہ اپنی بہن سے بہت مشابہ تھیں اس لئے لوگوں نے اس کے لئے بہت کوشش کی مگر اُس نے اپنے غریب محبوب شوہر کو بادشاہ پر ترجیح دی اور اُس کی جدائی گوارا نہ کی۔ معاملات نے یہاں تک طول کھینچا کہ اُس کے شوہر کو لکھنؤ سے میاں گنج بھیجکر زیر حراست کر دیا گیا اور فتح الدولہ محمد رضا برقؔ اُس کے ہمراہ گئے تاکہ سمجھا بجھا کر اُس کو بیوی سے کنارہ کشی کرنے پر آمادہ کریں، کئی مہینے کے بعد جناب مولوی سید محمد صاحب سلطان العلما کے حقیقی بھائی میر سید علی بھی نواب روشن الدولہ وزیر اعظم کی طرف سے نواب دولھا کو سمجھانے کی غرض سے تشریف لے گئے اور بقول سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ بہزار جد و جہد اس میں کامیابی ہوئی اور طلاق ہو گئی

ادھر نازک ادا پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ اُس کے انکار پر اُس کو ایک مکان میں زیر حراست کر کے چوکی پہرہ بٹھا دیا گیا مگر اس ترشی سے بھی اس کا نشہ نہ اُترا اور ایک روز موقع پاکر وہ قید سے نکل گئی اور کانپور میں اپنے شوہر سے جا ملی۔

مصنف دربار اودھ بیان کرتے ہیں کہ نازک ادا کے فرار میں نواب روشن الدولہ کا ہاتھ تھا اور طلاق دینے سے پہلے ہی نواب دولھا کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ تمھاری بیوی بہت جلد رہا ہو کر تم تک پہونچ جائے گی۔ نازک ادا کے غائب ہو جانے سے بادشاہ کی کاوشوں اور کاہشوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ چونکہ اس

معاملہ میں روشن الدولہ کا قدم درمیان تھا اس لئے اصل راز کا پتہ نہ چل سکا بادشاہ یہی سمجھے کہ جو کچھ ہوا وہ نواب دولھا کی چالاکی سے ہوا۔ تاہم انھوں نے لکھنؤ کا ایک ایک کونا ڈھونڈھ وایا اور جب تک انھیں یہ یقین نہیں ہوگیا کہ نازک ادا کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو پھر قدسیہ محل کی ہمشکل کی تلاش شروع کردی۔ بہت سی لڑکیاں بادشاہ کو ملاحظہ کرائی گئیں مگر اُن میں سے کسی کی طرف بھی رغبت نہ ہوئی۔ اگر بادشاہ کو کسی کا حسن و جمال پسند آتا تھا تو وہ سادہ مزاج ہوتی تھی اور اگر کسی میں شوخی پائی جاتی تو اس میں حسن کی خوبی نہ ہوتی۔ آخر کار ایک روز موقع پاکر روشن الدولہ نے باتوں باتوں میں اپنے ایک عزیز قریب کی لڑکی کا ذکر بادشاہ سے کیا اور بقول سید کمال الدین حیدر بادشاہ کو پردہ سے دکھا بھی دیا۔ مولانا نجم الغنی مولف تاریخ اودھ نے ان واقعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

روشن الدولہ نے اب دوسری تجویز یہ کی کہ قدسیہ بیگم کے چہلم کے بعد حضرت کا نکاح کسی نا کتخدا لڑکی سے ہو جائے تاکہ اُن کا غم غلط ہو۔ لیکن اس کام کو بذات خود انجام دینا چاہا تاکہ اُن کی گرم بازاری میں اور چار چاند لگ جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک روز بادشاہ کو دعوت کے حیلہ سے اپنے مکان پر بلایا اور زنانخانہ میں جہاں مستورات کا ہجوم تھا اپنے اہل و عیال کو نذر گزرانے کو پیش کیا اور مرزا باقر علیخاں سابق چکلہ دار روہیلکھنڈ کی لڑکی (یعنی اپنی سگی بھانجی قمر طلعت بیگم) بادشاہ کو دکھا دی۔ اس لڑکی کا رنگ سرخ و سفید جلد باریک آنکھیں بڑی بڑی۔ ہونٹ پتلے اور چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ بادشاہ کی طبیعت اُس کی طرف فوراً مایل ہوگئی اور اس کے خواستگار ہوئے مگر روشن الدولہ نے عرض کیا کہ یہ لڑکی بڑی عالی خاندان ہے، اگر طبیعت مبارک اُس کی طرف رجوع ہے تو اُس کے باپ کو شرفانہ کے طریقہ پر راضی کرنا چاہئے اور جس طرح سلاطین ماضیہ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ پیش آتے تھے اُسی طرح عقد شرعی کرکے خدمت مُبارک میں سرفرازی بخشی جائے۔ یہ صورت اُس کے والدین کی عزت کا موجب ہوگی اور شادی میں عذر کی گنجایش بھی نہ رہے گی، بادشاہ نے روشن الدولہ کی عرض قبول فرمائی اور شادی کے سرانجام کے واسطے ارشاد کیا۔

یہ لڑکی مرزا باقر علی خاں کی بیٹی اور مرزا حسین علی خاں سابق چکلہ دار کٹیہر (روہیلکھنڈ) کی پوتی تھی مرزا باقر علی خاں کو نواب روشن الدولہ کی سگی بہن گمانی خانم منسوب تھیں۔ مرزا باقر علیخاں کے ایک بیٹا علی محمد خاں (سراج الدولہ) اور صرف ایک ہی لڑکی قمر طلعت بیگم تھی۔

بادشاہ کی خواستگاری کے بعد روشن الدولہ نے اپنے بہنوئی مرزا باقر علی خاں سے اس طرح تذکرہ کیا کہ کسی مشاطہ نے آپ کی بیٹی کا ذکر حضرت تک پہونچایا ہے وہ اس سے عقد کے خواہاں ہیں اگر منظور ہو تو اس

کارخیر میں کوئی مضایقہ نہیں، انھوں نے جواب دیا میں غریب آدمی ہوں اور اہل دنیا یہی کہیں گے کہ یہ کام لالچ سے کیا گیا ہے، علاوہ اس کے بادشاہ کے سیکڑوں محل ہیں تین یوم رغبت کرکے خواص پورہ میں داخل کردینگے میری تمام عمر رسوائی ہوتی رہے گی اور لڑکی الگ کہے گی کہ آباجان نے جان بوجھ کر مجھ کو ڈبو دیا۔ تیسرے یہ کہ میں مفلس اور وہ بادشاہ، چھوٹے گھر بڑے سمدھیانے والی مثل ہوجائے گی بھلا اُن کے مقابلہ میں مجھ سے کیا ہوسکے گا اگر تمام اثاث البیت فروخت کرکے کچھ انتظام کر بھی لوں تب بھی یہی حکم ہوگا کہ کوئی وکیل نکاح کے لئے چلا جائے اس صورت میں تمام عمر بدنامی رہے گی کہ فلاں شخص نے اپنی بیٹی بطریق سریہ دیدی اور میری بیٹی کی پھر کبھی قدر و منزلت نہ ہوگی مگر روشن الدولہ نے انھیں سمجھایا اور مرزا باقر علی خاں کو رضامند کرکے بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ لڑکی کے باپ تو راضی ہیں مگر اس امر کے امیدوار ہیں کہ حضرت سر پر سہرا باندھ کر مع امرا و اعزہ اُن کے مکان پر تشریف لیجائیں۔ خانہ زاد کو اس امر میں کسی قدر دقت محسوس ہوئی مگر میں نے بھی ایسی شق لگائی کہ مرزا لاجواب ہوگئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ کیا مضایقہ حضرت بہ نفس نفیس تشریف لائیں گے مگر اُن کی شان کے موافق جہیز بھی ہونا چاہئے۔ وہ سمجھ گئے کہ جہیز میں کم سے کم دس بارہ لاکھ روپیہ صرف ہوں گے آخر مجبور ہوکر خاموش ہوگئے۔ اُن کے باقی سوالات میں نے قبول کرلئے اور جہیز کا بار اپنے سر لے لیا۔ اب اس لڑکی کو اپنے مکان پر مانجھے بٹھاؤں گا اور شادی کے تمام مراسم بھی خود ادا کروں گا، حضرت کوئی تاریخ سعید قرار دیکر اور سہرا باندھکر رزیڈنٹ اور تمام امرا اور رشتہ داروں کو ساتھ لیکر نوبت و نقارہ کے ساتھ تشریف لیجائیں اور اس امر میں کوئی مضایقہ نہیں آخر وہ بھی حضور ہی کا مکان ہے بادشاہ نے قبول فرمایا چنانچہ نواب نے سب سامان نوعروسی طیار کیا۔ مصنف دربار اودھ نے مانجھے کے جلوس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"دو گھڑی دن رہے درِ دولت (دولتخانہ آصفی قریب حسین آباد) سے روشن الدولہ کی کوٹھی تک لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ مکانوں کی چھتیں اور کمرے مردوں اور عورتوں سے معمور تھے۔ در دولت پر بھی اراکین سلطنت کا مع حواشی کے ایک کثیر مجمع تھا یہ لوگ نہایت زرق برق لباس پہنے مصروف انتظام تھے۔ زنانی ڈیوڑھی پر بیزار دل قسموں سے سواریاں اُتر رہی تھیں، کہاریاں خواجہ سرا دوڑ دوڑ کے سواریوں کے اُتارنے کا اہتمام کر رہے تھے قریب شام مانجھے کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ بادشاہ نے در دولت سے برآمد ہوکے پھاٹک کے بالائی کمرہ میں مانجھے کا جلوس دیکھنے کے لئے قیام کیا۔ بالاخانہ بہت بلند مقام تھا اور یہاں سے دور تک نظر جاتی تھی۔ بادشاہ کے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد نشان کا ہاتھی نظر آیا۔ اس ہاتھی پر نہادت کے علاوہ ایک اور شخص بیٹھا تھا جس کے ہاتھ میں نشان تھا جس کا پٹکہ نہایت بیش قیمت کارچوبی اور جڑاؤ کام کا تھا۔ اور علم کی جگہ ایک آفتاب نما گیند سونے کا لگا ہوا تھا۔ اس ہاتھی کے بعد دو ڈھائی سو ہاتھیوں کی قطار تھی جن میں سے

پہلے چند ہاتھیوں پر ماہی مراتب تھا جو شہنشاہ دہلی نے نواب اودھ کو بطور اعزاز کے بخشا تھا۔ باقی ہاتھیوں پر لوگ سوار تھے اور ہر ایک ہاتھی پر گنگا جمنی ہودے کسے ہوئے تھے۔ ان ہاتھیوں کے بعد قندھاریوں کا رسالہ تھا اُس کے پیچھے دو دیسی رسالے تھے۔ رسالوں کے بعد اخترِی نادری پلٹنیں تھیں اُن کے پیچھے تلنگوں کی پلٹنیں تھیں۔ ہر پلٹن کے ساتھ اُن کا جنگی باجہ بجتا جاتا تھا۔ پلٹنوں کے پیچھے متعدد تخت رواں تھے اور اُن پر شہر کی نامی کسبیاں مجرا کرتی چلی جاتی تھیں۔ اُن کے بعد مصنوعی آرایش کے ہزاروں تختے تھے اُن کے بعد مختلف قسم کے باجے تھے جن کی نغمہ سرائی سے کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی جب یہ ہلڑ بھی ختم ہوا تو تمام شہر کے سوانگیوں کے تخت گزرنا شروع ہوئے کسی تخت پر لیلیٰ مجنوں۔ کسی پر شیریں فرہاد اور کسی پر وامق و عذرا کا سوانگ تھا کسی پر بے سر لاش اور کسی پر تھالی میں سر دھرا ہوا جو باتیں کرتا جاتا تھا۔ بہت سے سوانگئے تمام جسم پر سفیدہ ملے مونڈھوں پر بیٹھے سیفیں نگلتے تھے کوئی منہ سے اتنا بڑا گولا اُگلتا جو منہ اچھی طرح کھولنے سے بھی دانتوں میں اٹکتا تھا۔ کوئی دانت سے پکڑ کر دیگ اُٹھاتا جس میں ایک آدمی بھی کھڑا ہوتا تھا۔ کوئی سموچی بوتلیں چباتا چلا جاتا تھا۔ کوئی چار چار پانچ پانچ سیفیں نگل کے سیفوں کے دستوں میں پانی بھرے ہوئے گھڑے لٹکائے ہوئے تھا الغرض ان تختوں کے ساتھ عوام تماشائیوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ ان تختوں کے بعد ایک سنہری چوکی پر جس پر نہایت اعلیٰ قسم کی سُرخ مخمل منڈھی ہوئی تھی اور نہایت بیش قیمت کام بنا ہوا تھا ایک طلائی لوٹا اور کٹورا رکھا ہوا تھا اور وہ تاروں سے چوکی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ چوکی کے گرد سیکڑوں چوبدار نقرئی طلائی عصے ہاتھوں میں لئے سلطانی بانات کی وردیاں پہنے ہٹو بچو کرتے چلے جاتے تھے۔ چوبداروں کے پیچھے پانچ ہزار خوان جن میں پنیڈیاں بھری ہوئی تھیں، مزدوروں کے سروں پر تھے۔ اُن کے بعد دلہن والوں کی طرف کی عورتوں کی ہزاروں فینسیں تھیں جن کے ساتھ بانکی مہریاں رشمی لہنگے پہنے تیل پانی سے درست فینس کا ایک کونہ پکڑے ساتھ ساتھ دوڑی چلی جاتی تھیں۔

بادشاہ نے معمولی مراسم کے خلاف اس شادی میں نہایت عجلت کی جسدن مانجھا آیا اُس کے صرف ایک دن بعد ادھر سے ساچق گئی پھر اُس کے دوسرے دن اُدھر سے مہدی آئی جس کے دوسرے دن بادشاہ بیاہنے کو گئے۔ بادشاہ کا دلی جوش تو ان جھگڑوں میں پڑنے کی بالکل اجازت نہ دیتا تھا لیکن چونکہ وزیر دُلہن کے سگے ماموں تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ کسی بات میں ہیٹی نہ ہونے پائے اور صرف یہی وجہ اس شادی میں اتنی دھوم دھام کی ہوئی۔

اس کنخدائی کے مصارف کے بارے میں مصنف دربار اودھ حصۂ اول میں لکھتے ہیں:- اودھ کے رنگیلے بادشاہ کی شادی نے لکھنؤ میں ایک عجیب دھوم دھام پیدا کر دی نواب سعادت علی خاں نے جس جزو رسی

اور انتظام سے خزانہ معمور کیا تھا اُن کے جانشینوں نے ویسے ہی فضول اور بیہودہ کاموں میں اُسے اُڑانا شروع کیا۔ اس شاہی شادی میں اسراف کا کوئی دقیقہ اُٹھ نہیں رہا۔ یہ بات مشہور تھی کہ شاہِ حال کی شادی جس شان و شوکت اور عظم و شان سے ہوئی ہے کسی اگلے حکمراں کی ایسی شادی نہیں ہوئی، الغرض یہ شادی لکھنؤ کی تاریخ میں اپنے اسراف اور فضول خرچی کی وجہ سے بہت نمایاں شہرت کے قابل سمجھی گئی۔

ابتدائی رسومات ادا ہو چکنے کے بعد بتاریخ ۱۳ رجب ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۵ء بروز ولادت حضرت علی علیہ السلام محفل شاہانہ آراستہ ہوئی۔ بادشاہ کے عزیز و اقارب و عمائدین و ارکین سلطنت۔ جنرل لو صاحب رزیڈنٹ اودھ اور بہت سے صاحبان والاشان اور ولایت کی عالی مرتبت خواتین بھی شریک بزم طرب تھیں۔ جنرل لو صاحب نے کمال اتحاد اور خصوصیت سے اپنے ہاتھ سے شاہ کے فرق مبارک پر سونے اور پھولوں کے سہرے باندھے بادشاہ نے اپنے دست مبارک سے ایک طلائی ورق لگی ہوئی گلوری پلیٹ میں رکھ کر اُن کو عنایت فرمائی، صاحب نے بہت تکلف سے لیکر نوش کی۔ غرض یہ صحبت بھی یادگار زمانہ ہوئی اور جب تاجدار اودھ کی بارات گئی تو اُس کا جلوس اور ساز و سامان مانجھے کے جلوس پر بھی فوق لے گیا۔ بعد عقد نکاح بادشاہ سہرا باندھے ہوئے محلسرا میں داخل ہوئے۔ دُلہن کے پاس بیٹھے۔ جملہ رسومات شادی ادا کی گئیں بلکہ اس شادی میں ایسی رسمیں بھی ادا کی گئیں جو بادشاہ کی کسی شادی میں ادا نہ ہوئی تھیں۔ بعد ازاں صبح کے سہانے وقت اپنی نوعروس کو مع سامان جہیز جو حسب بیان نواب روشن الدولہ چودہ لاکھ روپے کا تھا دولتخانہ قدیم نواب آصف الدولہ میں سہرے جلوے سے بیاہ کر لائے۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں دُلہن کو بادشاہ جہاں ممتاز الدہر خطاب اور کئی لاکھ روپے کے مرصع زیورات مثل چھپکا۔ نتھ و بینا و ہاتھوں کے گلابی ہیرے جڑے ہوئے کڑے عنایت کئے۔

چوتھی چالے کی رسمیں ادا ہونے کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ ہماری تمام بیگمات نئی دُلہن کو نذر گزرانیں کیونکہ ہماری جو پہلے شادی ہوئی تھی وہ والدین کی مرضی سے ہوئی تھی اور یہ شادی ہم نے خود اپنی پسند سے کی ہے۔ اس رشتہ کی بدولت دُلہن کے باپ باقر علی خاں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس ڈیوڑھی کے کل انتظامات انھیں کے ہاتھ میں آگئے۔ اُن کے بیٹے علی محمد خاں نے جو روشن الدولہ کے داماد اور اس تازہ محل کے بھائی تھے، سراج الدولہ کا خطاب اور علاقہ محمدی کی چکلہ داری پائی۔ دونوں باپ بیٹوں کی بیش قرار تنخواہیں سرکار شاہی سے مقرر ہوگئیں ——— شروع میں بادشاہ اس محل کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ کوٹھی فرح بخش سے دولتخانہ آصفی تک آٹھ گھوڑوں کی بگ گاڑی پر بادشاہ کے ہم پہلو سوار ہوتی تھیں مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بادشاہ کا دل ان کی طرف سے کھٹا پڑ گیا۔ سبب یہ تھا کہ بادشاہ حسن و جمال کے ساتھ عورت میں

بے حجابی ناز و کرشمہ بھی چاہتے تھے مگر یہ بات پردہ میں بیٹھنے والی بہو بیٹیوں میں کہاں۔

ایک دن[1] نصف شب کے بعد بادشاہ محل میں آرام کرنے کے ارادہ سے مسہری پر بیٹھ گئے اور ممتاز الدہر کا انتظار کرنے لگے وہ بوجہ شرم و لحاظ کے طلب فرمانے کی متوقع تھیں کہ یکایک برہم ہو کر دھنیا مہری سے کہا کہ میں بہت عرصہ سے بیٹھا ہوا انتظار کر رہا ہوں اور یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ دھنیا نے عرض کیا کہ ابھی نئی نویلی ہیں اس لئے شرم کرتی ہیں۔ اس جواب سے اور زیادہ چراغ پا ہوئے اور کہا ہم کو مدت سے معلوم ہے کہ تو نواب سے ملی ہوئی ہے اسی لئے باتیں بناتی ہے یہ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے، دھنیا سمجھی کہ اسوقت بیگم صاحب کی بے طرح خبر لیں گے اس لئے اس نے دوڑ کر اُن کی کمر پکڑ لی جب انھوں نے خوب زور کیا تو دھنیا زمین پر گر پڑی بادشاہ نے دھنیا کے سینے پر چڑھ کر اتنا مارا کہ بدن میں کئی جگہ ورم ہو گیا اور چلائی بیگم صاحب شرم و حیا کو اس وقت طاق پر رکھئے اور یہاں آکر میری جان بچائیے، غرضکہ بیگم دوڑی آئیں، بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئیں اور دھنیا کی گلو خلاصی ہو گئی۔

علاوہ[2] اس کے دولہن کی اماں جان جو محلسرائے سلطانی میں اپنی بیٹی کے ہمراہ رہتی تھیں اپنے بھائی روشن الدولہ کی بالکل ضد واقع ہوئی تھیں حالانکہ دونوں بھائی بہن ایک ہی ماں باپ سے پیدا تھے مگر دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بھائی حد درجہ کے شاہ خرچ اور بہن پرلے سرے کی خسیس پیسہ پیسہ پر جان دیتی تھیں، نوعروسی کے دن بادشاہ نے دو ہزار روپے تقسیم انعامات کے لئے مرحمت کئے وہ انھوں نے رکھ چھوڑے کسی کو نہ دئے۔ باورچی خانہ سے جو روٹیاں بچی ہوئی آتی تھیں اُن کو دھوپ میں سکھا کر جمع کرتی تھیں ایک دن بادشاہ نے شیرینی کی فرمائش کی انھوں نے دو روپیہ کی مٹھائی بازار سے منگا کر سامنے رکھدی جسکو بادشاہ نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ یہ سب باتیں بادشاہ کے بہت بار خاطر ہوتی تھیں اور اُن کو سراسر خلاف شان شاہی سمجھتے تھے۔ آخر میں[3] ایک نیا گل کھلا جس کی وجہ سے ممتاز الدہر بادشاہ کی نظروں سے بالکل گر گئیں۔ وہ یہ کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپے اور پینتالیس بدریاں دوشالوں، رومالوں، جامہ داروں اور گرمیوں کی پوشاک کے لایق جامدانی وغیرہ کے تھانوں کی اپنی ناموری سمجھ کر بیگم صاحب کو عنایت فرمائیں کہ تم بادشاہ کی بیوی ہوئی ہو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو تقسیم کر دو تاکہ وہ لوگ بھی یاد کریں کہ اُن کی کسی عزیزہ کی شادی بادشاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔

دُلہن نرسی صاحبزادی تھیں اُن کی والدہ معظمہ اُن کی اتالیقہ اور عقل کل تھیں انھیں کا حکم سب باتوں میں

---

[1] تاریخ اودھ مرتبہ مولانا نجم الغنی جلد چہارم۔ [2] تاریخ اودھ جلد چہارم۔ [3] قیصر التواریخ جلد اول۔

چلتا تھا۔ انھوں نے صرف بیجا سمجھ کر سب نقد و جنس بدستور رہنے دیا کسی کو تقسیم نہ کیا صبح کو جب بادشاہ بیدار ہوئے تو تقسیم کو دریافت کیا، بیگم صاحب کی اماں جان نے جواب دیا:۔ "آخر اس اسراف سے کیا فایدہ ہم تمھارا گھر بنانے آئے ہیں یا لٹانے کو"۔ یہ سنتے ہی بادشاہ کا شعلۂ غضب بھڑک اُٹھا اور اُٹھ کر باہر جانے لگے بیوی نے دامن پکڑ کر روکا تو فرمایا۔ "تو کنگلی ہے تو کیا کسی کو دے گی" محل کے باہر تشریف لائے تو راجہ غالب جنگ مہتمم دیوان عام سے فرمایا۔ "راجہ ہم نے اس نئے محل کو کنگلا محل خطاب دیا"۔ راجہ نے اُسی خطاب سے باآواز بلند ایک چوبدار سے کہا جاؤ کنگلے محل سے حضرت کا تاج[1] لے آؤ۔ اس وقت سے بیگم کنگلے محل کے خطاب سے مشہور ہوگئیں اور چار دن کی چاندنی اُن کی بھی ختم ہوگئی۔

اس سے بیگم اور اُن کے قرابت داروں کو بیحد صدمہ ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بیگم کو پندرہ سو روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے ملتے تھے اُن کے بھائی سراج الدولہ اُن کی تنخواہ پر قابض و متصرف رہتے تھے۔

سراج الدولہ کا مکان چودھری کی گڑھیا پر تھا جو منہدم ہوکر فروخت ہوچکا ہے صرف اُس کا پھاٹک باقی ہے جو شاکرہ منزل کا جزو ہوگیا ہے۔ موصوف کا ایک وسیع اور عالی شان امام باڑہ بھی محلہ نہرہ حال جگت نرائن روڈ حکیم مہدی علی خاں کے مقبرہ کے سامنے تھا۔ یہ عمارت بھی فروخت ہوچکی ہے اب اسمیں ہیوٹ انجینرنگ اسکول قائم ہے۔

ممتاز الدہر کی مجلسراو بارہ دری موسومہ چاندی خانہ و امام باڑہ محلہ ڈیوڑی آغا میر میں تھا۔ اب کل عمارت فروخت ہوکر ایک مہاجن کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔ بارہ دری اگلی حالت میں ابتک موجود ہے جس میں جناب پیارے صاحب رشید نے آخری مجلس پڑھی تھی اب یہ کل محلہ چاندی خانہ کے نام سے مشہور ہوگیا "بیگم" نے غدر کے تخمیناً بیس برس بعد سنہ ۱۸۷۷ء میں اپنے مکان مسکونہ چاندی خانہ میں انتقال کیا لاش امام باڑہ بوٹا صاحب واقع محلہ نہرہ میں سونپی گئی پھر کربلائے معلّٰی روانہ کردی گئی۔

شیخ تصدق حسین (بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی)

---

[1] اُس زمانہ میں رواج تھا کہ جس محل میں بادشاہ کا تاج تھا رکھا ہوتا تھا وہ کل محلوں کا سرتاج سمجھا جاتا تھا چنانچہ جس دن سے ممتاز الدہر بیاہ کر آئی تھیں اُسی دن سے سب ایمائی وزیر اعظم روشن الدولہ تاج شاہی انھیں کے محل میں رکھ دیا گیا تھا۔

ہنسی

کل شام معظم جاہی مارکٹ سے عابد روڈ آرہا تھا، سامنے ایک تانگہ مریل گھوڑے سے جُتا، چلنے کے بجائے گھسٹ رہا تھا، اور اس میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ تانگے کی رفتار اور میری چال میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ پورے دو فرلانگ سے میرے اور تانگے کے درمیان تین سوا تین گز کا فاصلہ چلا آرہا تھا۔ وہ لڑکی بہت خوبصورت اور خوش لباس تھی اور میرا دل ایک نامعلوم مسرت سے لبریز۔ میں نے اس مسرت کو اور زیادہ قوی بنانے کے لئے جیب سے ایک سگریٹ نکالا۔ ہندوستانی ایکٹروں کے انداز میں اپنے ہونٹوں کے کنارے جمایا اور دیا سلائی جلا ہی رہا تھا کہ سگریٹ ہونٹوں سے چھوٹ کر سڑک پر گر پڑا۔ سگریٹ اُٹھانے کے لئے جونہی جُھکا، فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تین چار غنڈے بڑے تمسخر آمیز انداز سے ہنس پڑے اور وہ لڑکی بھی مُسکرانے لگی، کیونکہ زمین سے سگریٹ اُٹھا لینے کی حرکت ان کے نزدیک ہنسی کے قابل تھی۔ لیکن اگر آپ کی جیب سے چار پیسے گر پڑیں اور جُھک کر اُٹھانے کے بجائے آپ سڑک پر اُکڑوں بیٹھ کر بھی وہ پیسے اُٹھالیں تو لوگ نہیں ہنسیں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کی ہنسی نے بھی زندگی میں کانٹے بچھا دئے ہیں۔ آپ نے شاید بظاہر لوگوں کی ہنسی کو اہمیت نہ دی ہو۔ لیکن آپ کے تحت شعور میں لوگوں کی ہنسی کا خیال ہمیشہ سے موجود ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں کہ لوگوں کی ہنسی کا کبھی خیال نہیں کرنا چاہئے۔ لوگوں کی ہنسی سے ڈرنا بڑی شرمناک بزدلی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لوگوں کی ہنسی سے دنیا کے واقعات پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

میرے پڑوس میں محکمہ جنگلات کے ایک بوڑھے کلرک رہا کرتے تھے۔ بیچارے بڑے کثیر العیال — مالی حالت اتنی خراب تھی کہ پانچ لڑکیاں جوان ہو چکی تھیں اور ابھی تک کسی کو ٹھکانے لگانے کا کوئی انتظام نہ ہو سکا تھا۔ بڑی لڑکی کی عمر اٹھائیس سال تھی اور لوگ ہنس رہے تھے۔

آخر ایک دن لوگوں کی ہنسی سے تنگ آکر بڑے میاں نے بڑی لڑکی کو ایک کھاتے پیتے خوش حال ادھیڑ عمر کے رنڈوے سے بیاہ دیا۔ لوگ اس پر بھی ہنستے لگے لوگوں کی ہنسی لڑکی کے رنڈوے شوہر پر بڑی گراں گزری اور اس نے ایک دن لڑکی کو طلاق دیدی۔ لوگ پھر ہنسنے لگے۔ لڑکی نے اس غم میں نماز

روزے شروع کر دئے۔ لیکن لوگ ان نمازوں کی بھی ہنسی اڑانے لگے ۔۔۔ آخر کار ایک رات لڑکی کہیں غائب ہوگئی۔ یہ کوئی بڑی ٹریجڈی نہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگوں کی ہنسی کو انسانی زندگی سے بڑا تعلق ہے۔ محکمہ جنگلات کے بوڑھے کلرک کی لڑکی کے واقعہ سے لے کر موجودہ جنگ عظیم کے سانچے تک ہر ٹریجڈی کے پس منظر کو دیکھئے تو اس پس منظر میں آپ کو لوگوں کے ہنستے ہوئے ہونٹ، ان میں سے جھانکتے ہوئے ٹیڑھے میڑھے دانت اور گندے مسوڑھے نظر آئیں گے۔ موجودہ جنگ عظیم کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ گزشتہ جنگ عظیم کے شکست خوردہ زبوں حال جرمنی پر ہنستے تھے اور لوگوں کی اس ہنسی نے جرمن قوم میں ایک ہٹلر پیدا کیا۔

محمد تغلق پر اس کے عہد کے لوگ۔ اس کی عجیب و غریب اسکیموں اور منصوبوں پر بہت ہنسا کرتے تھے۔ لیکن محمد تغلق نے ان لوگوں کی ہنسی کی مطلق پروا نہیں کی اور وہی سب کچھ کرتا رہا جو وہ کرنا چاہتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہنسنے والے لوگ ہنستے ہنستے مر بھی گئے۔ لیکن محمد تغلق آج بھی زندہ ہے۔ کارل مارکس نے جب معاشی مساوات کا نظام دنیا کے سامنے پیش کیا تو لوگ ہنس پڑے۔ مگر اسی ہنسی نے کارل مارکس کے سمند فکر پر تازیانے کا کام کیا۔ اور اس نے اس نظام کو ایک ممکن العمل نظام بنا کر پیش کیا۔

لوگوں کی ہنسی اکثر و بیشتر کھوکھلی ہوتی ہے۔ فرض کیجئے آپ بازار میں چلے جا رہے ہیں اور آپ کو محسوس ہی نہ ہو کہ آپ کا ازار بند شیروانی کے نیچے گھٹنوں کے بیچوں بیچ لٹک رہا ہے۔ تو لوگ ہنس پڑیں گے۔ آپ سوچیں گے کہ اس میں آخر ہنسی کی بات ہی کیا ہے۔ سڑک پر چلتے وقت میرا سر گھٹنوں میں تو جھکا نہیں رہتا کہ اپنے ازار بند کو دیکھتا رہوں ـــــ اور پھر ہنسنے والوں پر بھی تو ایسی باتیں بیت چکی ہیں۔ آج ہی صبح کا واقعہ ہے، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں ایک گرما گرم بحث کرتے کرتے مجھے بڑی زور کی چھینک آئی اور تھوڑی سی ناک بھی نکل آئی۔ میرے سامنے کوئی آئینہ تو نہیں تھا کہ دیکھ لیتا اور رومال سے ناک صاف کر لیتا۔ لیکن ایک صاحب بڑی زور سے ہنس پڑے۔ جب ان کی ہنسی کا سبب مجھے معلوم ہوا تو میں نے کہا۔ جب تک میں اپنی ناک صاف کر لوں۔ آپ ذرا اپنی آنکھ کا چیپڑ صاف کر لیجئے ـــــ ایک بڑا زوردار قہقہہ پڑا۔

ایسی ہنسی ذہنی گدگدی کی پیدا کی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں نتائج و عواقب کا بھی کوئی خیال نہیں ہوتا۔ لوگ اسی طرح ہنستے ہیں جس طرح نیند آگئی ـــــ سو گئے۔ نیند ختم ہوئی جاگ پڑے۔ اس میں تفکر کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہوتا۔

اس لئے دنیا کی تمام آسمانی اور مذہبی کتابوں میں اس کا بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی پر ہنسنے سے پہلے یہ ضرور سوچو کہ کوئی دوسرا بھی تم پر ہنسے گا۔ لیکن آج تو لوگ مذاہب پر بھی ہنستے ہیں اور جب سے انسان نے مذاہب کا مذاق اڑانا شروع کر دیا ہے کیسی کیسی لعنتیں، نحوستیں، پریشانیاں۔ آسمان سے نازل

ہو رہی ہیں۔ کالج میں دینیات کے ایک پروفیسر تھے۔ مولانا خجندی عرفانی شیرازی ان کی داڑھی ڈیڑھ بالشت لمبی تھی۔ اور وہ مسجد شہید گنج کی خونریزی کا باعث صرف اس بات کو بتاتے تھے کہ مسلمان دعائے قنوت بھول گئے ہیں۔ مولانا کے آگے جب دوسرے سیاسی اور مذہبی وجوہات پیش کئے جاتے تو مولانا برافروختہ ہو کر فرماتے "ہشت۔ پہلے دعائے قنوت یاد کرو" ہم سب ہنس پڑتے — یوں تو ہر کالج میں دینیات کے پروفیسروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے کالج کے مولانا کی تو بہت زیادہ ہنسی اڑتی تھی۔

میری خواہش ہے کہ آج رات کے کھانے کے بعد آپ ایک آرام کرسی پر دراز ہو کر غور کریں کہ لوگوں کی ہنسی نے زندگی کو تکلفات کی سلاسل میں کس بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ آپ کو اپنا یا اپنے بیوی بچوں کا اتنا خیال نہیں رہتا جتنا کہ لوگوں کی ہنسی کا خیال ستاتا رہتا ہے۔ آپ کپڑے پہنیں گے تو ایسے کہ لوگ دیکھ کر نہ ہنسیں، سڑک پر چلیں گے تو اس چال سے کہ لوگوں کو ہنسنے کا موقعہ نہ ملے۔ کسی کھانے کی دعوت میں شریک ہوں گے تو پہلے یہی کوشش کریں گے کہ کانٹے چمچے کا اس احتیاط سے استعمال کریں کہ لوگوں کو ہنسی نہ آئے — میں کہتا ہوں آخر اس طرح لوگوں سے ڈرتے رہنے اور اپنا لہو پینے سے کیا حاصل — زندگی کو اس طرح تکلفات کی زنجیروں میں جکڑ کر انسان ہنسی خوشی کی زندگی کیسے بسر کر سکتا ہے۔

میں تو اس زندگی سے اُکتا گیا ہوں — یہ شیروانی پہنوں تو لوگ ہنسیں گے۔ میلا پائجامہ پہن کر باہر جاؤں تو لوگ ہنسیں گے۔ سائکل کا ٹیوب بیچ سڑک پر پھٹ جائے تو لوگ ہنسیں گے۔ چھینک کے ساتھ ناک نکل آئے تو لوگ ہنسیں گے۔ ازار بند گھٹنوں میں لٹکنے لگے تو لوگ ہنسیں گے۔ زندہ رہوں تو لوگ ہنسیں گے مر جاؤں تو لوگ ہنسیں گے۔

کیا لوگوں کو ہنسنے کے سوائے اور کوئی کام ہی نہیں زندگی میں — اور مجھ میں اتنی جرأت کیوں نہیں کہ میں لوگوں سے کہہ دوں کہ صاحب اس شیروانی کا رنگ شوخ ہے تو میں کیا کروں یہ ایک ہی شیروانی ہے میرے پاس۔ کانٹے، چمچے سے کھانا کھانا زمانے کا رواج ہے تو کیا ہوا۔ لیکن جب تک میں ہاتھ سے بھر پور نوالے بنا بنا کر نہ کھاؤں، میرا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ میں میلا پاجامہ پہن کر سڑک پر آگیا ہوں، اس لئے کہ لانڈری سے دھلے ہوئے پاجامے لے آؤں۔

اس میں ہنسی کی کیا بات — میں نماز پڑھتا ہوں تو بھی ضعیف الاعتقاد میں ہوں — اور ضعیف الاعتقادی تھیٹر کے مسخرے کا سوانگ تو نہیں کہ آپ ہنسیں، میں نے داڑھی چھوڑی۔ اس پر میری بیوی کو ہنسی نہیں آتی تو آپ کیوں ہنستے ہیں — جلسۂ عام میں کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہوں تو آپ کیوں ہنستے ہیں۔ مجھے ایسے ہی انداز نشست میں آرام ملتا ہے۔ میں اپنے آرام کو سوچوں یا آپ کی ہنسی کا

خیال کروں میری سائیکل کا ٹیوب بیچ سڑک پر پھٹ گیا تو آپ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ آپ نے کیوں یہ نہیں سوچا — ٹیوب پُرانا ہوگا۔ پھٹ گیا ہوگا۔ اور ٹیوب کے پھٹ جانے کا میری ذات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ لوگوں کی ہنسی کا بنیادی سبب کیا ہے۔ ایک بات جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت شر انگیز ہے۔ میں آپ پر اس لئے ہنستا ہوں کہ آپ کو نیچا دکھاؤں۔ اور آپ مجھ پر اس لئے ہنستے ہیں کہ آپ مجھے نیچا دکھائیں۔ ہر انسان ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ یہ فطرت کی شر انگیزی ہے یہ قطعاً غیر انسانی فطرت ہے۔

جب سے انسان نے بات بات پر ہنسنا شروع کر دیا ہے۔ وہ ہنستا رہتا ہے۔ مگر اس ہنسی سے اس کی روح کی مسرت مر جاتی ہے۔ کل شام بڑی زور سے بارش ہو رہی تھی۔ میں ایک سائبان کے نیچے کھڑا بارش کے تھم جانے کا انتظار کر رہا تھا کہ معاً سڑک پر سے جاتے ہوئے ایک سفید پوش کا پاؤں پھسل گیا اور وہ کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن میں نے اپنی ہنسی روک لی — یہ رُکی ہوئی ہنسی میری روح میں حیات افروز مسرت بن کر اُترنے لگی — آپ بھی کبھی آزما دیکھئے۔ مگر آپ تو اس بات پر بھی ہنس رہے ہیں!۔

ابراہیم جلیس

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر کی بندرگاہوں اور ماریشس

کو جانے والے ہمارے مسافر اور مال کے جہازوں کی آمد و رفت دوران جنگ میں ناگزیر حالات کے باعث بے قاعدہ ہو گئی تھی۔ اب ہماری سروس پھر اُسی باقاعدگی اور حُسن و خوبی سے جاری ہو گئی ہے اور ہمارے جہاز بمبئی سے

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

جانے آنے لگے ہیں۔ اور امید ہے کہ ہم حسب طلب دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے۔
مال اور مسافروں کی بکنگ کے متعلق تفصیلات معلوم کرنے کے لئے لکھئے :-

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶، بنک اسٹریٹ - بمبئی

قدیم سنسکرت لٹریچر

(تاریخی وادبی نقطۂ نظر سے)

ہندو مسلم اختلاف کی موجودہ نوعیت چاہے کچھ ہو، لیکن بہرحال ان دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر رہنا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر یہ مقالہ پیش کیا جا رہا ہے جو دراصل ایک تصنیفی حیثیت رکھتا ہے اور مسلسل نگار میں شایع ہوتا رہیگا اُردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور ہم فاضل مصنف کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنا یہ بیش بہا سرمایۂ تحقیق نگار کو مرحمت فرمایا۔

مقالہ کی اہمیت وجامعیت اور اس کی دلکشی کا اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد آپ خود کر سکیں گے، اظہار کی ضرورت نہیں۔ یقین ہے کہ قارئین نگار اس سلسلہ کو بہت دلچسپ پائیں گے اور ان اوراق کو حفاظت کے ساتھ رکھیں گے۔

نیاز

ہندوستان میں مسلمان تقریباً ایک ہزار برس بلکہ اس سے زاید عرصہ سے آباد ہیں لیکن اُن میں مشکل سے چند لوگ ایسے نکلیں گے جو قدیم سنسکرت لٹریچر کی عام تاریخ سے واقفیت رکھتے ہوں یا جنھوں نے اُسکے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہو۔ اُردو زبان میں بھی شاید اس موضوع پر کوئی مضمون اسوقت تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اس لئے محض واقفیت عامّہ کی غرض سے اس مضمون کے تحریر کرنے کی جرأت کی گئی ہے اور معتبر ذرائع سے معلومات فراہم کرکے اس لٹریچر کی تاریخ کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے قدیم باشندے

قدیم زمانہ میں یہاں مختلف قومیں آباد تھیں جن کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک اقوام ڈراوڈ جن میں تامل۔ تلنگا وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری اقوام منڈا جن میں بھیل۔ گونڈ۔ کول وغیرہ داخل ہیں۔ یہ امر ثابت نہیں ہے کہ یہ قومیں

ہندوستان کی اصلی باشندہ تھیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ اقوام ڈراوڈ ترکی النسل تھیں اور ہندوستان کے شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں اور کول وغیرہ کا ہندوستان کے مشرق یعنی "آسام" وغیرہ کی جانب سے داخل ہونا قیاس کیا گیا ہے۔ منڈا قوم جابجا اب بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہے لیکن یہ غیر مہذب حالت میں ہے اور اسوقت بھی تقریباً ایسی بولیاں بولتی ہیں جو سنسکرت سے ماخوذ ہے ڈراوڈ قوم کے مہذب و شایستہ ہونے کے آثار قدیم زمانہ میں بھی پائے جاتے ہیں اور اُن کی بولیاں سنسکرت سے بالکل علٰحدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے لٹریچر میں عام زبان اور ادبی زبان کی تفریق کی جاسکتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں اُن لوگوں نے اتنی ترقی کرلی تھی کہ وہ شہروں میں رہتے تھے۔ دھات کے زیور اور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ مکان کی آرایش فرنیچر سے کرتے تھے اور مویشی کی دولت سے مالا مال تھے۔ اس وقت یہ قومیں زیادہ تر دکن میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں ان کے علاقہ کو سنسکرت زبان میں آندھر کہتے ہیں لیکن پُرانے زمانہ میں یہ لوگ ہندوستان کے شمال میں بھی آباد تھے۔

لنکا کے رہنے والے بھی ایک علٰحدہ قوم ہیں اور اُن کا کوئی تعلق آریا یا ڈراوڈ اقوام سے نہیں ہے۔ موجودہ اقوام ڈراوڈ کی نسبت محققین نے یہ رائے قایم کی ہے کہ وہ اس وقت مخلوط النسل ہیں۔ البتہ منڈا قومیں بحالت موجودہ غیر مخلوط ہیں اور اُن کی نسل اُسی طرح چلی آتی ہے جیسی قدیم زمانہ میں تھی۔

ہندوستان میں اقوام آریا کا ورود

اقوام منڈا اور ڈراوڈ کے زمانۂ حکومت میں ہندوستان کے شمال مغرب سے براہ افغانستان اجنبی فرقے گروہ در گروہ ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہوئے جن کو آریا کہا جاتا ہے۔ یہ اُسی قسم کے گروہوں میں سے تھے جو کم و بیش اسی زمانہ میں ایران میں داخل ہوئے تھے اور جنھوں نے اُس ملک کا نام ہی اپنے نام پر ایریانا یا ایران رکھ دیا۔ وہ بھی اپنے آپ کو آریا کہتے تھے جیساکہ دارایاوش شہنشاہ ایران نے اپنے ایک کتبہ میں اپنی نسبت یہ لکھا ہے کہ میں آریا ہوں اور آریا کا لڑکا ہوں۔ بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آریا ایک بہت قدیم لفظ اَر سے مشتق ہے جس کے معنی ہل کے ہیں۔ یہ لفظ متعدد شکلوں میں مختلف آریا اقوام میں پایا جاتا ہے اور یہی مفہوم رکھتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے نزدیک آریا کے معنی ہل چلانے والے یا کھیتی کرنے والے کے ہیں اور تورانیوں کے مقابلہ میں آریا اقوام کو اس لفظ سے اس لئے منسوب کرتے تھے کہ تورانی خانہ بدوش، بھیڑ پالنے والی لٹیری اقوام تھیں اور آریا کھیتی کرنے والے اور ہل چلانے والے۔

اقوام آریا کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُن کا داخلہ ایران اور ہندوستان میں وسط ایشیا کے اُس علاقہ سے ہوا ہے جس کو اب جنوبی روس کہتے ہیں یعنی تقریباً وہ علاقہ جہاں حال میں روس اور جرمنی کی فیصلہ کُن لڑائی

ہوئی تھی اور جس کو اسٹالن گراڈ کہتے ہیں یہ مقام ایک طرف ترکستان سے ملحق ہے اور دوسری طرف کوہ قاف کی طرف کھلتا ہے۔ جب یہ قومیں وہاں تھیں تو گلہ بانی اور کاشتکاری کی منزل تک ترقی کر چکی تھیں۔ تاہم خانہ بدوشی کی کیفیت سے خالی نہ تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اُن کے مختلف فرقے ہجرت کرتے رہتے تھے چنانچہ بہت قدیم زمانہ میں اُن کے بعض فرقے جرمنی۔ سرویا۔ یونان اور اطالیہ کی اطراف میں پہونچ گئے اور اس کے بعد بعض فرقے روس کے جنوبی علاقے سے ایران اور ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ یہ امر پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچا ہے کہ یہ سب فرقے یا گروہ متحد النسل تھے کیونکہ کسی ملک میں اگر سب لوگ ایک ہی قسم کی بولی بولیں تو اُس کے یہ معنی نہیں سمجھے جا سکتے کہ وہ ایک ہی نسل کے ہیں اسی طرح ان قوموں کے اصلی وطن کے بارے میں مختلف رائیں قیاس کی ذیل میں ظاہر کی گئی ہیں۔

ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ قومیں دراصل کسی برفستانی مقام کی رہنے والی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس حد سے آگے قدم بڑھا کر یہ قیاس کیا ہے کہ اُن کے اصلی مقام آئس لینڈ اور آئرلینڈ ہو سکتے ہیں۔ آئس لینڈ کا پرانا نام ایرن ہے اور آئرلینڈ کے لفظ کا جزو اول لفظ آریا سے ملتا جلتا ہے۔ بعض محققین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان اور ایران میں آنے والے فرقے مغل نسل سے آمیزش پا چکے تھے۔ بہرحال یہ قومیں اصل میں کہیں کی رہنے والی ہوں یہ امر ظاہر ہے کہ جرمنی، یونان وغیرہ کی قومیں اور ہندوستان و ایران کی قومیں کسی زمانہ میں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ یہ نتیجہ اس امر پر مبنی ہے کہ ان قوموں کی زبانوں کے متعدد الفاظ ایک ہی ہیں مثلاً گاؤ۔ برادر۔ مادر۔ پدر۔ دیور۔ بیوہ۔ ہر (ہل) ستھان وغیرہم۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ایران اور ہندوستان کی زبانوں میں الفاظ کی مماثلت بکثرت ہے اور جرمنی وغیرہ ملکوں کی زبانوں میں بہت کم تعداد میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو سب زبانوں میں پائے جاتے ہوں۔ الفاظ مذکور کی بنا پر کئی اور نتیجے بھی مترتب ہوتے ہیں۔

ایک بات تو یہ کہ جرمنی وغیرہ کی طرف جو فرقے گئے وہ بہت قدیم زمانہ میں گئے تھے اور ایران و ہندوستان میں آنے والے فرقے اس کے بعد علٰحدہ ہوئے۔ دوسری بات یہ کہ جب یہ سب فرقے اکٹھے رہتے تھے تو اُس زمانہ میں یہ لوگ گائے وغیرہ پالتو جانور رکھنے لگے تھے۔ خاندان اور گھر بنا کر رہنے لگے تھے۔ کاشت بھی کرتے تھے اور قبیلے یا جتھے کی شکل میں زندگی بسر کرتے تھے۔

غرض کہ یہ وہ فرقے تھے جو تہذیب کے اس مرحلہ پر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اُن کی بدولت ہندوستان میں وہ زبان جاری ہوئی جو سنسکرت کہلاتی ہے اور وہ لٹریچر ظہور میں آیا جو اس مضمون کا موضوع ہے۔ اگرچہ یہ لٹریچر بہت ضخیم ہے لیکن اُس میں تاریخی پہلو ندارد ہے اور مذہبی افسانوں Mythology

اور ادوار زمانی کا جو بیان ہے اُس سے ان اقوام کے ہندوستان میں داخل ہونے کے زمانہ کی تعیین یا صحت کے ساتھ واقعات کی جانچ پرتال ناممکن ہے۔ اگر اس بیان کو صحیح سمجھا جائے تو یہ تسلیم کرنا لازم ہوگا کہ یہ قومیں گویا روزِ اول ہی سے ہندوستان میں موجود تھیں اور تخلیق کائنات کا سارا سلسلہ انھیں اقوام اور ملک ہندوستان ہی سے متعلق ہے۔ لیکن مستشرقین مغرب نے اس باب میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقوام آریا ہندوستان میں (بقول میکس مُلر) بارہ سو سال قبل مسیح سے داخل ہونا شروع ہوئیں اور محققین مابعد کے نزدیک بھی یہی رائے قابل اعتبار مانی گئی ہے اور اس زمانہ کو کسی طرح پندرہ سو سال قبل مسیح سے اُس طرف نہیں مانا جا سکتا۔

تاریخ نویسی کی طرف عدم توجہی کے کئی اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ برہمنوں نے اس طرف اس لئے توجہ نہیں کی وہ دنیا کو سرائے فانی سمجھتے تھے اور دنیا کے کاروبار کو محض دھوکا اور فریب تصور کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ واقعہ نگاری کو اس لئے قصداً نظر انداز کر دیا گیا کہ برہمنوں کو اپنا وقار و تسلط قایم رکھنا تھا اور اُنھوں نے صرف انھیں علوم کی طرف توجہ کی اور اُن کو اپنے طبقے سے مخصوص کر لیا جن سے اُن کا اقتدار برقرار رہے اور وہ سب ذاتوں کے سرتاج بنے رہیں۔ منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی خیال میں آتا ہے کہ ابتدائی گروہ اور فرقے اپنی طبیعت کے اعتبار سے مذہبی تخیل اور مبالغہ کے ایسے دلدادہ تھے کہ واقعہ نگاری سے معذور تھے۔ انھیں دونوں باتوں سے سارا قدیم لٹریچر بھرا ہوا ہے اور یہی سلسلہ سیکڑوں برس تک قایم رہا اور اگرچہ اتہاس کے نام سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن مذہب اور مبالغہ نے اُن کتابوں کو افسانہ کے رنگ میں رنگ دیا۔ اُس کے بعد زمانہ کی رنگت بدلی۔ بہت سی اجنبی قومیں تاتاری۔ جاٹ۔ گوجر وغیرہ ہندوستان میں داخل ہوگئیں۔ اول تو خود وہ اقوام جن کو آریا کہا جاتا ہے مختلف النسل اور مغل نسل سے مخلوط خیال کی جاتی ہیں۔ دوسرے جب وہ لوگ ہندوستان میں آباد ہوگئے تو وہ یہاں کے باشندوں میں مخلوط ہوگئے اور بعد میں تاتاری اور دوسری قومیں بھی انھیں میں ہل مل گئیں۔ اس طرح سے ہندوستان کی سب جدا جدا قومیں مخلوط ہوکر ہندو اقوام بن گئیں لیکن قدامت پسندی کے جذبات نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ ان سب باتوں کو تاریخی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ ایران کی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ پیشدادی اور کیانی بادشاہوں کا حال افسانہ کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا اور سکندر کے حملہ کے بعد سے کئی سو سال تک جو زمانہ گزرا ہے وہ سب نظر انداز کر دیا گیا اور ساسانی حکومت کے آغاز کو کیانی حکومت کے دور سے ملا دیا گیا۔ یعنی اولاً مبالغہ اور شاعری نے تاریخ کو افسانہ کا جامہ پہنائے رکھا اور بعد میں قومی غرور نے صفحۂ تاریخ سے پانچ سو سال کے اوراق نیرنگ

ساسانی خاندان کے بانی اردشیر بابکاں کے حکم سے نکال پھینکے۔

آریوں کے لٹریچر کی اہمیت

باوجود اس کمی کے ہندوستان کا قدیم لٹریچر جو آریا اقوام سے منسوب ہے بہت اہم ہے اور موجودہ زمانہ کے ہندوؤں کی معاشرت۔ مذہب اور ذہنیت کا اس لٹریچر سے از اول تا آخر مسلسل پتہ چلتا ہے۔ اس لٹریچر کا مطالعہ زمانہ حال میں کئی نئے علوم کی ایجاد کا باعث ہوا ہے۔ مثلاً بین الاقوامی علم اللسان اور بین الاقوامی علم الاصنام۔ متعدد اور مختلف علوم پر یہ لٹریچر مشتمل اور حاوی ہے۔ مثلاً علم الاصوات۔ ریاضی۔ نجوم۔ صرف و نحو۔ طب۔ قانون وغیرہم۔ مخصوص طور پر فلسفہ اور مذہب نے اس لٹریچر میں بہت بلند پایہ حاصل کیا ہے۔ سب سے بڑی اہمیت اس لٹریچر کی اور اُس تہذیب کی جو اس لٹریچر سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ ہندوستان ہی کی پیداوار ہے۔ یہیں پھولی پھلی اور بیرونی رنگ آمیزی سے پاک وصاف رہی۔ وہ اُنھیں اقوام آریا کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں داخل ہوئیں اور جنھوں نے مسلسل اُنھیں روایات پر اپنی تہذیب و زبان کو جاری رکھا جو وہ اپنے ساتھ باہر سے لائے تھے۔ اُنھیں روایات کی بنا پر اپنا قومی مذہب براہمنی اور بین الاقوامی مذہب بدھ قایم کیا اور اول الذکر کو قدیم روش ہی پر قایم رکھا۔ یہ وہ لٹریچر ہے جس کا قدیم ترین حصہ اب بھی حفظ یاد کیا جاتا ہے۔ جن الفاظ میں سورج دیوتا سے تین ہزار برس پیشتر دُعا مانگی جاتی تھی وہی الفاظ اب بھی دُہرائے جاتے ہیں اور جس طرح نکاح کی رسم اُس زمانہ میں ادا ہوتی تھی اُسی طرح اب بھی ادا کی جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ لٹریچر ادب۔ مذہب۔ فلسفہ اور معاشرت کے لحاظ سے ایک عظیم الشان تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے جس کا اگر مطالعہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اُس سے اپنی اپنی طبیعت کے مطابق عام واقفیت حاصل ہو جانا غیر مفید نہیں ہو سکتا۔

آریا لٹریچر کا رسم الخط

اس لٹریچر کی کوئی یادگار کتابی صورت میں سن عیسوی سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں پائی جاتی۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانہ میں جن چیزوں پر لکھا جاتا تھا وہ پائیدار نہیں ہوتی تھیں۔ بھوج پتر اور تاڑ کے پتوں پر لکھنے کا رواج تھا اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو جلد تلف ہو جاتی ہیں۔ لکھنے کے دو طریقے تھے۔ ایک تو گیلی چیز سے گہرے نقش کر کے اُن میں کاجل یا کالک بھر دی جاتی تھی۔ اس کا رواج زیادہ تر جنوبی ہند میں تھا۔ دوسرا وہی طریقہ تھا جو آج کل رائج ہے یعنی برّد اور سیاہی سے لکھا جاتا تھا۔ برّد کو کلم کہا جاتا تھا۔ اور سیاہی کو مشی۔ دوسری صدی قبل مسیح کا ایک کتبہ سیاہی سے لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے۔ غالباً اُس کا استعمال اِس سے بھی دو ایک صدی پیشتر

جاری ہو چکا ہوگا۔ تاڑ کے پتوں پر لکھ کر اُن کے علیحدہ علیحدہ ورق تیار کئے جاتے تھے اور اُن میں سوراخ کرکے اور ڈورے ڈالکر (گرانتھ) گانٹھ لگادی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہی لفظ گرانتھ بمعنی کتاب ہو گیا۔ کاغذ کا استعمال مسلمانوں کی آمد کے وقت سے جاری ہونا پایا جاتا ہے غالباً ناپاکی کے خیال سے چمڑا وغیرہ کام میں نہیں لایا جاتا تھا اگر اِس سوال کا جواب کہ تحریر کا رواج ہندوستان میں کب سے جاری ہوا اُس نقطۂ نظر سے دیا جائے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے یعنی یہ کہ ہندوستان میں آریوں کی قدیم لٹریچر اور تہذیب ازلی ہے تو جواب یہ ہوگا کہ کتابت کا سلسلہ بھی ازلی ہے اور برہم سے نکلا ہے جس کی بنا پر مستعمل حروف تہجی کو براہمی کہتے ہیں (ملاحظہ ہو کتاب پراچین لپی مالا مصنفہ گوری شنکر اوجھا ۱۹۱۸ء)۔ محققین کی جانچ پرتال کا نتیجہ یہ ہے کہ تحریر کا رواج ہندوستان میں چھٹی صدی قبل مسیح کے آس پاس ہوا ہے۔ یہ تو ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کتاب کی شکل میں کوئی شے سن عیسوی سے پہلے کی لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن شہنشاہ اشوک کے کتبے چٹانوں اور لاٹوں پر پائے گئے ہیں جن سے تحریر کے رواج کا تیسری صدی قبل مسیح میں ہونا مسلّم ہے۔ علاوہ ازیں ایک سکّہ بھی چوتھی صدی قبل مسیح کا برآمد ہوا ہے جس پر عبارت منقوش ہے لکھنے پڑھنے کا حوالہ ایسی قدیم کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے جن کی تصنیف چوتھی صدی قبل مسیح سے منسوب ہے۔ ایسی صورت میں یہ نتیجہ نکالنا کہ چوتھی صدی قبل مسیح سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ تحریر کا رواج ہندوستان میں تھا درست نہ ہوگا۔ کئی اُمور ہیں جو اس نتیجہ کی تائید کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ عام رواج کے لئے ایک مدت لازمی ہے۔ دوسرا یہ کہ ابتدائی حروف میں جو ترقی ہندوستان میں ہوئی وہ کسی عرصہ ہی میں ہو سکتی ہے تیسرا یہ کہ قدیم زمانہ میں طریقۂ تعلیم ہندوستان میں ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھا۔ اور لکھنے کے بجائے زبانی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ اب بھی مقدس کتابیں اسی طرح پڑھائی جاتی ہیں اور حفظ کرائی جاتی ہیں۔ اس لئے اگر کتابت کا حوالہ چوتھی صدی سے قبل نہیں ملتا تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ اُس زمانہ میں لکھنے کا رواج نہ تھا۔

حروف کی ایجاد اہل فنیشیا سے منسوب کی جاتی ہے۔ فنیشیا وہ علاقہ ہے جہاں شہر صور اور سیدون فلسطین کی حدود سے متصل بحر (روم) بڑی ٹرے نین کے ساحل پر واقع ہیں۔ فنیشیا والے اُس تجارت پیشہ سامی قوم کے فرقے تھے جنھوں نے بعض محققین کے نزدیک مصر کی کتابت سے اور بعض کی تحقیقات کے مطابق عراق کی کتابت سے حروف اخذ کئے اور اپنی تجارت کے سلسلہ میں مختلف ملکوں میں پھیلا دئے چنانچہ خیال کیا جاتا ہے کہ عراق ہوتے ہوئے اس طور پر یہ حروف ہندوستان پہونچے۔

تحقیقات سے قدیم ہندوستان میں دو قسم کے رسم خط کا رائج ہونا پایا جاتا ہے ایک جس کو

خروشتی کہتے ہیں، گندھار (مشرقی افغانستان) اور شمالی پنجاب میں رائج تھا۔ اور دائیں جانب سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا۔ یہ خط اُس خط سے ماخوذ ہونا بیان کیا جاتا ہے جو اَرمی کہلاتا ہے۔ (اَرم ملک شام کا ایک حصہ عراق سے متصل ہے)۔ دوسرے خط کا نام براہمی ہے۔ ہندوستان کا یہی خط قومی خط ہے اور اسی سے مختلف ہندی خطوط نکلے ہیں۔ یہ بائیں طرف سے دائیں جانب لکھا جاتا ہے۔ لیکن خیال ہے کہ پہلے یہ بھی سیدھی طرف سے اُلٹی طرف لکھا جاتا تھا۔ کیونکہ جو سکہ چوتھی صدی کا براہمی خط میں برآمد ہوا ہے اُس کی کتابت دائیں جانب ہی سے ہے۔ یہ خط اُس شمالی سامی خط سے ماخوذ مانا گیا ہے جس کو ابھی اہل فنیشیا کی کتابت ظاہر کیا گیا ہے۔ اور اُس خط سے مماثلت رکھتا ہے جو تقریباً ایک ہزار قبل مسیح میں عراق کے باٹول اور پتھروں پر لکھا ہوا پایا گیا ہے ـــــ کہا جاتا ہے کہ عراق کے راستہ سے (۲۲) حروف ہندوستان پہونچے تھے جن پر سے اہل ہند نے چھیالیس حروف مرتب کئے اور مکمل قاعدے اور اُصول کے ساتھ اُن کی ایسی ترتیب دی جو کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی۔ یہی حروف اب تک جاری ہیں اور ایسا نیاں کیا جاتا ہے کہ وہ پانچویں صدی قبل مسیح تک مکمل طور پر وجود میں آچکے تھے کیونکہ ایک کتاب صرف و نحو میں جس کی تصنیف کو چوتھی صدی قبل مسیح سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اُن کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں شک لانے والی بات صرف اس قدر پائی جاتی ہے کہ اگر حروف تہجی اس قدر پہلے مکمل ہو چکے تھے تو شہنشاہ اشوک کے میناروں اور لاٹوں پر جن کی تحریر کا زمانہ تین سو قبل مسیح کے بعد کا ہے وہ حرف کیوں استعمال میں نہیں لائے گئے۔

(باقی) ح ـــ ا

اس تصنیف کے آیندہ صفحات میں جن جن مباحث پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ویدی اور سنسکرت لٹریچر کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر مفصل بحث نہ کی گئی ہو۔ ان کی زبان، ان کے اخلاقی و مذہبی تعلیمات، ان کا فلسفہ اور ان کے تمدنی و اجتماعی اثرات سبھی پر بسیط گفتگو کی گئی ہے، جس سے نہ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت لٹریچر اور ہندو قوم کا ایک دوسرے سے کتنا قدیم اور کیسا اہم تعلق ہے، بلکہ یہ بھی کہ ہندوؤں کی مذہبی لٹریچر نے قدیم ہندوستانی ذہنیت میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں اور خالص ادبی نقطۂ نظر سے اس نے اپنے بعد کیا قیمتی ترکہ چھوڑا۔

ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلامی نظریۂ سیاست

سید ابوالاعلیٰ مودودی موجودہ دور میں اسلامیات کے ممتاز ترجمان ہیں اور اُنھوں نے اسلام کے بعض اہم تمدنی مسایل جہاد وغیرہ کی توضیح و تشریح کامیاب عنوان سے کی ہے لیکن اس طرف کچھ عرصہ سے اُنھوں نے اسلامیات کی ترجمانی میں خاص قسم کے متقشفانہ اجتہاد سے کام لینا شروع کیا ہے، جسے ہم صرف راہبانہ انداز کی تقدس پسندی کہہ سکتے ہیں، آپ کے ان جدید اسلامی نظریات کی اہم کڑیاں "اسلام کا نظریہ سیاسی" اور "راہ عمل" وغیرہ ہیں۔

ان رسایل میں جناب مودودی نے اپنے جدید سیاسی نظریہ کی تفسیر کے لئے جو عنوان اختیار کیا ہے وہ "استدلالی" سے زیادہ "خطابی" ہے۔ جناب ممدوح کی تحریروں کا ایک نمایاں نقص یہ ہے کہ "خطابت" کے غیر معمولی بہاؤ کے ہنگامہ میں منطقی تنظیم کا سررشتہ گم ہو جاتا ہے اس لئے اس کا نتیجہ خالص علمی حیثیت سے تشفی بخش نہیں ہوتا۔

اس مقالہ میں ان کے رسالہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" سے بحث کی جائے گی۔ اس میں تو شک نہیں کہ جناب مودودی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ہمیں باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟ مگر سوال یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی تعیین میں اس اُصول پر خود مودودی صاحب نے کہاں تک عمل کیا ہے؟ کیا خود اُنھوں نے پہلے سے اپنے "فکری رجحانات" کے تحت ایک نظریہ قایم نہیں کر لیا اور پھر کھینچ تان کر اُسے اسلام کے سر عاید نہیں کر دیا گیا؟

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو:

جناب مودودی نے "اسلام کے سیاسی نظریے" کو اسلامی نظریات کی اساس بتاتے ہوئے انبیا علیہم السلام کے مشن کا تذکرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے:-

"قرآن میں ایک جگہ نہیں کثیر مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جن سے انبیا کی لڑائی تھی اللہ کے منکر نہ تھے، ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اُسی کے اشارے سے چل رہا ہے، وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے، اُسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں"۔

اس خالص تاریخی دعوے کے ثبوت میں مودودی صاحب نے قرآن کریم کی حسب ذیل آیتیں لکھی ہیں:-

۱- "قل لمن الارض ومن فیہا ان کنتم تعلمون۔ سیقولون للہ قل افلا تذکرون۔ قل من رب السمٰوات السبع ورب العرش العظیم۔ سیقولون للہ قل افلا تتقون۔ قل من بیدہ ملکوت کل شیئ وہو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون۔ سیقولون للہ قل فانی تسحرون (المومنون ۵۰)

ولئن سالتهم من خلق السموات والارض وسخر الشمس والقمر ليقولن الله فانى يؤفكون ولئن سالتهم من نزل من السماء ماءً فاحيا به الارض من بعد موتها ليقولن الله - (العنکبوت)

ان آیات کے لکھنے کے بعد مودودی صاحب نے فرمایا ہے :-

"ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اُس کے خالق ہونے اور مالک ارض وسما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے لہذا ظاہر ہے کہ انھیں باتوں کے منوانے کے لئے تو انبیا کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب پوچھئے کہ انبیا کی آمد کس لئے تھی اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟ قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیا کہتے تھے جو تمھارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمھارا رب اور اللہ بھی ہے اسکے سوا کسی کو اللہ اور رب نہ مانو مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لئے طیار نہ تھی۔"

استدلال کی پہلی منزل طے کرنے کے بعد مودودی صاحب نے رب اللہ اور معبود کے معنی بتائے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور کسی دوسرے شخص کی عبادت نہ کی جائے۔ یعنی غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہے لیکن کفار و مشرکین اس عبودیت کی زندگی کو اللہ سے خاص نہیں کرتے بلکہ بہت سے انسانوں کے لئے بھی عبودیت کی یہ زندگی وقف کر دیتے ہیں، یہیں سے تمام خرابیاں پھوٹتی ہیں۔ اسلام اسی فتنہ اور فساد کی جڑ پر تیشہ لگانا چاہتا ہے۔ اُس کی ریاست کا تخیل اسی محور کے ارد گرد گھوم رہا ہے۔"

جناب مودودی کے اس استدلال کا ہر جزو منطقی احتیاط سے بے نیاز ہے، نگاہ غور کو اس دلیل کا تحلیل و تجزیہ کرنے پر صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک تاریخی چیز کے ثابت کرنے کے لئے جن واضح شہادتوں کے پیش کرنے کی ضرورت تھی اُن سے یک لخت قطع نظر کرتے ہوئے قرآن فہمی سے مستغنی ہو کر خواہ مخواہ کا ایک نظریہ اسلام کے سر عاید کر دیا ہے۔

جناب مودودی کا یہ دعوے کہ تمام کفار و مشرکین کو یہ تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق بھی ہے سیرت خیز ہے۔

اس وقت اور انبیا کو تو جانے دیجئے۔ خود جناب سرور کائنات کی بعثت کے وقت مختلف مذاہب موجود تھے۔ عرب کی تاریخ اس سچائی کی پوری قوت کے ساتھ شہادت دیتی ہے۔ صاحب سیاہ الذہب لکھتے ہیں:

"عرب کے مذاہب ایک دوسرے سے الگ اور مختلف قسم کے تھے۔ کچھ تو فنا کرنے والے دہر کے قایل تھے اور کچھ خالق عالم کا اقرار کرتے تھے لیکن بعثت و نشر کے قایل نہ تھے۔ کچھ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ کچھ یہودی تھے، کچھ نصرانی۔"

اس وقت سیاہ الذہب ہی پیش نظر تھی اس لئے اُسی کا اقتباس دے دیا گیا ورنہ یہ حقیقت عرب کی تمام تاریخی کتابوں میں مل سکتی ہے، اس کے علاوہ اگر فہم سلیم کی طرف رجوع کی جائے اور اپنے ارد گرد کے مشاہدوں سے نتیجہ نکالا جائے تو قدم قدم پر اس کا ثبوت مل سکتا ہے کہ بہت سے انسانی دماغ اس قسم کے ہوتے ہیں جن میں کسی طرح خدا کے وجود کا تصور سماتا ہی نہیں۔ اُنھیں خدا کے وجود کا سرے سے انکار کرنا ہی عقل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اُنھیں ارباب مذاہب کے "اللہ" کا تسلیم کرنا عقل نعوذ باللہ کا نشان دکھائی دیتا ہے، ایسے لوگ رسول کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ اُنکے

پہلے بھی تھے۔ اُن کے بعد میں بھی رہے ہیں اور اب بھی ہمارے آس پاس ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، علم کلام کی کتابوں میں رسول و نابئیں رسول کی زنادقہ و ملاحدہ سے اس سلسلہ کے مناظرے بکثرت پائے جاتے ہیں" فکری تنزل و نظری رجعت پسندی" کی حد یہ ہے کہ باوجودیکہ رسول کریم نے توحید کے نہایت ہی گرانقدر تنزیہی سبق اپنی اُمت کو دئے تھے لیکن انھیں میں ایسے افراد بھی ملتے ہیں جو خالق عالم کی تجسیم کے قایل ہیں یا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خالق عالم اپنی برگزیدہ مخلوق کے قالبوں میں حلول کرتا ہے۔

شاید اس صورتِ حال سے بچنے کے لئے اگر یہ دعوےٰ کیا جائے کہ ایسے لوگوں سے انبیا کو کوئی تبلیغی تعلق نہ تھا، اُن کا جھگڑا تو صرف اُن کفار و مشرکین سے تھا جو زمین و آسمان کے خالق (اللہ) کو رب اور معبود نہیں مانتے تھے تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سرورِ کائنات یا دوسرے اولوالعزم پیغمبروں کا بھی تبلیغی مشن نہایت تنگ و محدود تھا اور ان کی ہدایت صرف مخصوص قسم کے کفار کے لئے مخصوص تھی اور ان کفار کو جن کی عقلی نظر الٰہیاتی مسایل کے متعلق کوتاہ تھی انبیا کی ہدایت سے فایدہ اُٹھانے کا کوئی براہ راست موقع نہ تھا۔ اولوالعزم پیغمبروں کی تبلیغی وسعتوں کے متعلق یہ خیالات اُن کی پیغمبرانہ عظمت کے منافی ہیں، اگر جناب مودودی نے کفار و مشرکین کے بعد یہ قید "جن سے انبیا کی لڑائی تھی" اسی غرض سے بڑھائی ہے اور وہ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ انبیاء کی لڑائی خاص قسم کے کفار سے تھی اور ان کے علاوہ جو دوسرے قسم کے کفار تھے اُن سے انبیا کی لڑائی نہ تھی تو یہ نہایت دلچسپ بات ہوگی اصل تو یہ ہے کہ انبیا کی لڑائی اُن سب سے تھی جو الٰہیاتی و تمدنی جادۂ حق سے منحرف تھے۔ اُن کا جھگڑا تمام کفار سے تھا وہ بلا استثنا کل ضالین و منکرین کو سیدھے راستہ پر لانا چاہتے تھے اور اُن کی ہدایت و ارشاد کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا تھا۔

واضح رہے کہ قرآن مجید کے اکثر مقامات اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ تاریخ کا پس منظر پیش رکھتے ہوئے اُن کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ مودودی صاحب سے یہی غلطی ہوئی ہے کہ وہ تاریخی پس منظر کو ان مقامات پر نظر انداز کر گئے ہیں۔

جناب مودودی نے جن آیتوں سے اپنے مطلب پر استدلال کیا ہے وہ اُن کے لئے قطعاً مفید نہیں ہیں۔ ان آیات میں جن کفار کا ذکر ہے وہ بیشک مخصوص قسم کے ہیں جیسا کہ سابق آیات سے ظاہر ہے اُن میں پہلے ان کفار کا یہ شیر درج کیا گیا ہے کہ "جب ہم مرجائیں گے اور ہڈیوں اور مٹی میں منتقل ہو جائیں گے تو کیا پھر سے ہم زندہ کئے جائیں گے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کفار اُس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو خدا کا معترف تو تھا لیکن بعثت (پھر سے زندہ ہونے کا) منکر تھا۔ مودودی صاحب نے جو آیتیں اپنے مطلب کے اثبات کے لئے نقل کی ہیں وہ انھیں کفار کے خیال کی رو سے تعلق رکھتی ہیں جو پھر سے زندہ کئے جانے کے منکر تھے یا جو خدا کو مانتے تھے لیکن بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اس کا سبب یہ بیان کرتے تھے کہ اس سے خدا کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔

معتبر تفسیروں میں اس کی تشریح بھی موجود ہے۔ ایسی صورت میں ان آیتوں سے یہ نتیجہ نکالنا کسی منطق کی بنا پر یہ درست نہیں ہو سکتا کہ اس وقت ایسے کفار موجود نہ تھے جنھیں اللہ کے ہونے اور اُس کے خالقِ ارض و سما ہونے میں شک تھا، خود قرآنی آیتوں سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔

اس کے ماسوا یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ سرورِ کائنات خاتم المرسلین ہیں اُن کی تعلیمات تاقیامت ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے ہے۔ ایسی حالت میں اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ اُس وقت اللہ کے منکر کافر موجود نہیں تھے بلکہ رسول کا مقابلہ جن کافروں سے تھا وہ سب کے سب اللہ کے قایل تو تھے مگر اُس کو اپنا رب اور معبود ماننے کے لئے آمادہ نہیں تھے تو اسکا جواب کیا ہوگا کہ آنحضرت کے بعد اب اس زمانہ میں ایسی قومیں موجود ہیں جو خدا کے وجود کا اقرار نہیں کرتیں۔ اسلام کا تخاطب تو اپنی عالمگیری حیثیت کی وجہ سے ان سے بھی ہوگا۔ انھیں کیونکر وہ رسول یا وہ مذہب نظر انداز کر سکتا ہے جو ہر زمانہ کے لئے اور ہر قوم کے لئے ہدایت و ارشاد کا سرچشمہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اسلام کا جس نے حکیمانہ مطالعہ کیا ہے اُس کے لئے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ اُس کا "مجادلۂ حسنہ" عام تھا۔ آفاق گیر تھا اور ہے۔ اُس کی زد میں مشرکین و کفار کی تمام صنفیں آتی ہیں۔ اس کا فرق کئے بغیر کہ وہ صانع عالم کے ماننے والے تھے یا انکار کرنے والے۔ اس کے ثبوت میں اسلامی تاریخ سے ایسے کثیر شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں، جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ انبیا اور اُن کے نائبین نے اپنی تعلیمات سے زندیقوں اور ملحدوں کے دماغوں سے الٰہیاتی نظر کی کجی دور کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہ البتہ سچ ہے کہ اس کے علاوہ بھی دوسری عقلی و اخلاقی و معاشرتی و تمدنی بیماریوں کا دفع کرنا اُن کے پروگرام میں داخل تھا۔ مودودی صاحب نے انسانیت کی روح کے لئے جس بیماری کو ام الامراض سمجھا ہے اور جس کے تنہا ازالہ کو انبیا کا واحد مشن قرار دیا ہے وہ بھی اپنے اکثر مظاہر میں اخلاقی و تمدنی بیماری ہی قرار پاتی ہے اور اس لئے اُس کا ازالہ بھی انبیا کے فرائض میں داخل ہے لیکن وہی سب کچھ نہیں ہے۔ اُس سے اہم بیماریاں اور بھی ہیں۔

اس تقریر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جناب مودودی کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ جن کفار و مشرکین سے انبیا کی لڑائی تھی وہ سب کے سب اللہ کو خالق عالم کے ماننے والے تھے، اب آیئے جناب مودودی کے استدلال کے دوسرے حصہ پر بھی نظر کر لی جائے۔ مودودی صاحب نے ارشاد کیا ہے کہ یہ تمام کفار و مشرکین اللہ کو خالق و مالکِ ارض و سما ماننے کے بعد انبیا کے اس دعوے کو نہیں مانتے تھے کہ "جو تمھارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے اور تمھارا رب اور اللہ بھی ہے اس کے سوا کسی کو اللہ اور رب نہ مانو" اس تشریح کے بعد فاضل موصوف نے "اللہ۔ معبود اور رب" کے معنی بتائے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:

"اللہ کے معنی معبود کے ہیں۔ معبود کا مادہ عبد ہے، عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے خدمت کے لئے کھڑا ہونا۔ احترام میں ہاتھ باندھنا۔ اعتراف بندگی میں سر جھکانا۔ فرماں برداری میں دوڑ دھوپ کرنا۔ جس کام کا اشارہ ہو اُسے بجا لانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ عبادت کا اصلی مفہوم ہے اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔ اسی طرح رب کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرماں برداری کی جاتی ہے لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے جس سے نوازش اور سرفرازی کی اُمید رکھے جس سے عزت و ترقی دامن کا جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے وہی اُس کا رب ہے" ان تمام تشریحات کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس قسم کے اللہ۔ معبود اور رب بننے کی آرزو انسانوں ہی کے دلوں میں نشو و نما پا سکتی ہے۔

اس قسم کی ہوسِ خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے اس لئے وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعوےٰ پیش کر دیتے ہیں دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے پاس فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں سو وہ اس سے کام لیکر کسی روح کسی دیوتا کسی قبر کسی سیارے کسی درخت کو اللہ بنا دیتے ہیں۔ فاضل مودودی نے استدلال کے اس حصہ میں خطابت سے بہت زیادہ کام لیا ہے"۔

غالباً فاضل موصوف اسے تو ضرور تسلیم کریں گے کہ قرآنی الفاظ و عبارات کے سمجھنے کے لئے اُس وقت کے عربی زبان و محاورات پر عبور کی ضرورت ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے۔ اس لئے کسی خاص نظریہ کے ثابت کرنے کے لئے اپنی طرف سے الفاظ کے معانی اور آیات کے مفاہیم معین کر دینا دیانتِ تحقیق کے منافی ہے۔ اگر فی الحقیقت ہمیں قرآن کریم و معتبر احادیث سے کسی چیز کو سمجھنا ہے تو پھر لغاتِ عرب کے مطابق اُس وقت کے تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُن کے صحیح صحیح مفاہیم و معانی معین کرنا چاہئے۔ ان چیزوں کا مطلب سمجھتے وقت ہمیں اس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے کہ اب دنیا کا معاشرتی اُصول و قوانین کے متعلق کیا نقطۂ نظر ہے یا مابعد الطبیعیاتی و فلکیاتی حقایق کے بارے میں اب انسانی تحقیق کا قدم کس منزل میں ہے؟ کیونکہ اگر ان سے متاثر ہو کر قرآن کی ترجمانی کی گئی تو یہ نہ تو اسلامی حیثیت ہی سے کوئی پسندیدہ چیز ہوگی اور نہ آزاد علمی حیثیت ہی سے ان ترجمانیوں کو کوئی علمی اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔ نئے نئے خیالات و نظریات سے مرعوب ہو کر اگر ان کے سانچہ میں قرآن مجید کے مطالب کو ڈھالنے کی کوشش کی گئی تو حقیقتاً اسلامی خیالات کیا ہیں، اس کا پتا چل ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ صحیح اسلامی خیالات کی نشر و اشاعت سے جو ہماری اصلاح کا فایدہ تھا وہ بھی اس طرزِ عمل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو مذہبی خسارہ ہوا لیکن جو لوگ مذہب سے وابستہ نہیں ہیں اُن کے لئے ان غیر مناسب غلط قسم کی ترجمانیوں کی وجہ سے مختلف خیالات کے "صحیح ارتقائی سلسلہ" کی کڑیوں کا دریافت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

اس تقریر کا مدعا یہ ہے کہ ہم قرآن کے معانی و مفاہیم معین کرتے وقت لغاتِ عرب کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمارے لئے اس کا دیکھنا ضروری ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم اُس وقت کی عربی زبان میں کیا تھا؟ اس لئے مناسب یہ ہے کہ مودودی صاحب کے خیالات کا جایزہ لینے سے پہلے متعلقہ لغات کے ذریعہ سے یہ تحقیق کر لی جائے کہ ان الفاظ کے حقیقتاً مفہوم کیا ہیں؟

رب اللہ معبود اور خدا

صاحب کشاف نے لفظ "اللہ" سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔ (واضح رہے کہ علامہ زمخشری صاحبِ کشاف کی حیثیت نہ صرف بحیثیت ایک مفسر بلکہ بحیثیت ایک امام لغت کے بھی بہت زبردست ہے)

"والالٰہ من اسماء الاجناس کالرجل والفرس اسم یقع علیٰ کل معبودٍ بحقٍ او باطلٍ ثم غلب علی المعبود بحق کما ان النجم اسم لکل کوکبٍ ثم غلب علیٰ الثریا وکذالک السنۃ علی عام القحط والبیت علی الکعبۃ

الٰہ اسمائے اجناس میں سے ہے جیسے رجل (مرد) فرس (گھوڑا)۔ یہ وہ اسم ہے جس کا اطلاق ہر معبود پر ہوتا تھا خواہ وہ حق ہو یا باطل پھر اُس کا استعمال معبود برحق ہی کے لئے ہونے لگا۔ جس طریقہ سے "النجم" ہر ستارے کا

نام ہے لیکن اب "ثریا" ہی کو کہتے ہیں، اسی طریقہ سے "السنۃ" کا لفظ ہے جس کا اب استعمال قحط کے سال پر ہوتا ہے البیت" کی بھی یہی حالت ہے۔ اس کا استعمال اب خانۂ کعبہ ہی کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔

دوسری لغت کی کتابوں میں بھی یہی چیز ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں "معبود" کے معنی پر بھی غور کر لینے کی ضرورت ہے۔ عام عربی لغت کی کتابوں میں عبادت کے معنی طاعت کے ہیں۔ "عبداللہ" کے معنی یہ بتائے گئے ہیں — "وحدہ وخدمہ وخضع وذل فطاع لہ" یعنی اُسے ایک مانا۔ اُس کی خدمت کی اُس کے سامنے عجز وانکسار سے کام لیا اور نتیجہ میں اُس کی پرستش کی۔ رب کے معنی بتاتے ہوئے بیضاوی نے لکھا ہے "ولا یطلق علیٰ غیرہ تعالیٰ الا مقیداً" اللہ کے علاوہ جب کسی اور پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا تو کسی قید کے اضافہ کے ساتھ۔

الفاظ زیر بحث کے ان لغوی معنوں پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ استعمال میں الہ۔ اللہ اور رب کا مصداق وہی ایک ذات واجب الوجود ہے اس لئے آیۂ "ما علمت لکم من الٰہ غیری" (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا ہے) اور آیۂ "لئن اتخذت الٰہاً غیری لاجعلنک من المسجونین" (اگر تو نے میرے سوا کسی اور خدا تسلیم کر لیا تو میں تجھے جیل بھیجدوں گا) میں "الہ" سے مراد وہی معبود برحق یعنی اللہ ہے۔

حضرت موسیٰ کا فرعون سے جھگڑا

فرعون وغیرہ سے حضرتِ موسیٰ کا صرف یہی جھگڑا نہیں تھا کہ وہ حضرت موسیٰ سے بھی اسی کا طلبگار تھا کہ اللہ کو فاطر السموات ماننے کے بعد اپنی تمام اطاعتوں کا مرکز فرعون کو قرار دے لیا جائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فرعون اپنے دل میں اپنے کو اللہ نہ مانتا ہو لیکن فکری حیثیت سے غیر تربیت یافتہ دماغوں کو اس طرف آمادہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ اُسے خدا مان لیں۔ عام انسانی عقلیں "الٰہیاتی تصورات" کے ادراک میں بہت ہی درماندہ ہوتی ہیں۔ اُن کے پست افہام سے زیادہ قریب یہی ہے کہ خدا "مجسم" ہو، مادہ اور مادیات سے بالکل ہی منزہ خدا کا عقیدہ اُنھیں دماغوں میں سما سکتا ہے جن کی بصیرت کی آنکھوں میں حکمت وفلسفہ نے سرمہ لگایا ہے۔ عام عقلوں کے لئے تو اس عقیدۂ تنزیہ کا سمجھنا بہت ہی دشوار ہے اس کے سمجھنے میں بڑے بڑے متشرع ٹھوکریں کھا چکے ہیں۔

ایسی حالت میں اگر فرعون دوسرے لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لاکر اپنے کو خدا منوانا چاہتا ہو تو اس میں حیرت و تعجب کی کوئی بات نہیں — اس سلسلہ میں جو قرآنی الفاظ ہیں مثلاً لئن اتخذت الٰہاً غیری لاجعلنک من المسجونین ان سے اُسی مطلب کی تعیین نہیں ہوتی جو مودودی صاحب نے معین کرنا چاہا ہے۔ کم سے کم قرآنی الفاظ میں تو دوسرے معنی کی بھی گنجائش موجود ہے اور جبکہ "الہ" استعمال عرب میں معبود بحق یعنی اللہ کے لئے مخصوص ہوگیا ہے تو مطلقاً معبود کے معنی میں یہاں استعمال کیونکر فرض کیا جا سکتا ہے، جب تک کہ یہ نہ واضح کر دیا جائے کہ "الہ" کا معبود بحق کے معنی کے لئے استعمال میں مخصوص ہو جانا نزول قرآن کے بعد کی چیز ہے۔

فاضل مودودی نے اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایران میں لفظِ خدا بادشاہ کے لئے استعمال ہوتا تھا یعنی اللہ کے نہیں۔ اس کے لئے "خدائے خدایگان" کا لفظ تھا۔ لفظ "خدا" کا استعمال بادشاہ کے لئے فارسی میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ لغت کی کتابوں میں لفظ خدا کی جو تشریح کی گئی ہے وہ اس استعمال کو "غیر اللہ" کے لئے جائز نہیں قرار دیتی۔

صاحبِ ہفت قلزم لکھتے ہیں :-

"خدا نام باریتعالیٰ است مستجمع جمیع صفات و مخفف "خودا" ہم است یعنی شخصے کہ خود آمدہ باشدہ"۔

ظاہر ہے کہ خود آنے والی ذات "واجب الوجود" ہی ہوسکتی ہے۔ ایسی حالت میں بادشاہ کے لئے اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ دماغی بلادت کی وجہ سے کسی انسان کو کچھ نادان، اللہ۔ واجب الوجود۔ خالق عالم سمجھ لیں اور اُس کے لئے خدا کا لفظ استعمال کر دیں لیکن اس استعمال سے مودودی صاحب کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔ البتہ خداوند کا لفظ بہت ہی ہلکا ہے۔ اس کا استعمال بادشاہ کے لئے کیا معمولی رئیسوں کے لئے بھی ہوسکتا ہے۔

حضرت ابراہیم کا احتجاج

فاضل مودودی نے اپنے دعوے کے اثبات میں حسب ذیل آیت سے کام لیا ہے:-

"الم تر الی الذی حاجّ ابراہیم فی ربہ ان آتٰہ اللہ الملک اذ قال ابراہیم ربی الذی یُحیی ویمیت۔ قال انا احی وامیت قال ابراہیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بہا من المغرب فبہت الذی کفر"۔ تو نے دیکھا اُس شخص کو جس نے ابراہیم سے حجت کی اس بارہ میں کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ اور یہ حجت کیوں کی اس لئے کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اُس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت تو میرے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

فاضل مودودی نے اس آیت کا رخ اپنے نظریہ کی طرف اس عنوان سے موڑا ہے "غور کیجئے۔ وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا۔ اس لئے کہ وہ اللہ کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا قایل تھا کہ کائنات کا فرمانروا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے۔ جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون تھا بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں اور خصوصاً ارضِ بابل کے باشندوں کا مالک کون ہے؟ وہ اللہ ہونے کا دعوے نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعوے رکھتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں کا رب میں ہوں۔ حضرت ابراہیم سے اُس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے رب تسلیم کرو۔ میری بندگی اور عبادت کرو مگر جب حضرت ابراہیم نے کہا کہ میں تو اُسی کو رب مانوں گا اور اُسی کی بندگی و عبادت بھی کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لئے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیونکر قابو میں لاؤں؟

فاضل مودودی کو کافر کے ہکا بکا رہ جانے کے متعلق اس قدر بعید تاویل کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔

اصل میں حضرت ابراہیم نے یہ "مجادلۂ حسنہ" جس شخص سے کیا ہے وہ صحیح معنوں میں اللہ کی ہستی سے واقف نہ تھا۔ اسرارِ اُلوہیت کی محرمی کا اُسے شرف حاصل نہ تھا۔ وہ حکومت کے نشہ میں خدا کو بالکل بھُلا چکا تھا۔ اُسنے ابراہیم سے اُن کے خدا۔ اللہ کے متعلق جاہلانہ لہجہ میں سوال کیا حضرت ابراہیم نے جواب میں فرمایا کہ میرا خدا وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ تو معارضہ کرتے ہوئے اُس نے کہا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے (میں جس کو چاہوں ابھی ہلاک کر دوں اور جسے چاہوں ہلاکت سے بچا دوں پھر مجھے کیوں اللہ نہیں مانتے؟) اس متمرد نے حکومت کے نشہ میں

حضرت ابراہیم کے استدلال کی متانت پر نظر نہیں کی تھی اور نہایت ہی بھونڈی بات زبان سے نکال بیٹھا تھا۔ اس لئے فوراً خدا کے اس رسول نے جواب میں کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اگر تو واقعی اللہ ہے تو سورج کو مغرب سے نکال۔ چونکہ مخالف بہت ہی مہمل بات زبان سے نکال چکا تھا اور حضرت ابراہیم کا برجستہ جواب اُس پر چسپک کر رہ گیا تھا جس سے اُس کے پاس نجات پانے کی صورت نہیں رہ گئی تھی اس لئے لازمی طور سے اُسے ہکا بکا رہ جانا چاہئے تھا۔ آیت کا اصل مطلب یہی معلوم ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کا مطلب اگر لیا جاتا ہے تو اس مقام پر اُس کافر کے ہکا بکا رہ جانے کی کوئی معقول وجہ نہیں نکلتی۔ وہ کافر حضرت ابراہیم کے جواب میں کہہ سکتا تھا کہ آپ کا جواب اصل بحث سے ربط نہیں رکھتا۔ میں اللہ کا تو منکر نہیں ہوں۔ ارض و سما۔ شمس و قمر کا خالق تو وہی ہے۔ وہی انکی گردشوں کا مالک ہے، میرے تصرف کا ہاتھ "خدائے خدایگاں" کے مخصوص اختیارات تک نہیں پہونچ سکتا، میں تو صرف تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا رب قرار دو یعنی میری فرماں برداری کرو۔ میرا حکم مانو۔ میں تمہارا حاکم ہوں۔ اللہ خالق السمٰوات والارض نہیں ہوں جو سورج کو مغرب سے نکالوں۔

کیا مودودی صاحب اس کا دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ اُس کافر کا یہ جواب اُس منزل پر کافی نہیں تھا؟ اور کیا حضرت ابراہیم کو اس جواب کے بعد سپر انداختہ نہ ہو جانا پڑتا؟ یہ سب خرابی کیوں ہے؟ محض اس لئے ہے کہ "معبودیت" کے مخصوص نظریہ سے مودودی صاحب مرعوب ہو گئے ہیں اور قرآنی مطلب کی تعیین اسی مرعوبیت کے ماتحت کر رہے ہیں۔

اسلام یقیناً تمام ممکنات اور ان کے مجموعہ کو ایک ایسی ہستی کے فیض رسانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود (خود آ) ہے۔ یہی وہ ذات مستجمع جمیع صفات ہے جسے انسان کی عبادت و پرستش کا واحد مرکز قرار دیا گیا ہے۔ ہماری حقیقی اطاعت و فرماں برداری کا وہی آقائے کونین و مالک دارین مستحق ہے لیکن چونکہ وہ حکیم علی الاطلاق بھی ہے اُس نے اس کائنات کو سائنٹفک نظام کا پابند دیا ہے اور وہ اس دنیا میں عام بدنظمی Disorder کی حالت دیکھنا پسند نہیں کرتا اسی لئے انسانوں کے "مدنی الطبع" ہونے کا پہلو مدنظر رکھتے ہوئے اُس نے دنیا میں اطاعت و فرماں برداری کا حقدار دوسرے مخصوص انسانوں کو بھی قرار دیدیا ہے کیونکہ حیوانات کے ایسے گروہ میں جو ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کرتا ہے اطاعت و فرماں برداری کے دایرے کو وسعت دینے کی ضرورت تھی۔ بغیر اس کے تمدنی نظام باقی ہی نہیں رہ سکتا تھا تاہم اطاعت و فرماں برداری کے دایرے کی یہ توسیع اور اُس کے ماتحت ایک انسان کا دوسرے انسان کی فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرنا۔ جس کام کا وہ اشارہ کرے اُسے بجالانا جس کے خلاف وہ حکم دے اُس پر چڑھ دوڑنا اور جہاں اُس کا فرمان ہو اپنا سر بھی کٹوا دینا عمومی حیثیت سے اسلام ناپسندیدہ نہیں قرار دیتا کیونکہ اس اطاعت کا سرچشمہ اطاعتِ الٰہی کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔ (باقی)

سید اختر علی (تلہری)

(نگار) اس مقالہ کا باقی حصہ آیندہ اشاعت میں درج ہوگا جس میں مودودی صاحب کے "تصور ریاست اسلامیہ" "اسلامی ریاست کے مقتدر" اور "استخلاف فی الارض" وغیرہ سے بحث کیجائیگی۔ اس سلسلہ میں اگر مودودی صاحب جو کچھ لکھنا چاہیں تو شوق سے لکھ سکتے ہیں۔ میں خود بھی ان کی تحریروں کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جلد اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔ نیاز

توام بچّے

(نفسیاتی تحقیق)

نومبر ۴۵ء کے نگار میں ایک مختصر مضمون بعنوان "توام بچّے" شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک نئی نفسیاتی تحقیق کی ابتداء ہوئی ہے جس کا تعلق توام بچّوں کی زندگی اور نفسیات سے ہے۔ ماہرین نفسیات کی تحقیق سے مثالیں دیکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ توام بچّے نفسیاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے کس قدر یکساں ہوتے ہیں۔ اُن کے عادات و اطوار اور رجحانات ہی میں یکسانیت نہیں ہوتی بلکہ امراض کا حملہ بھی ایک ہی وقت ہوتا ہے۔ ایک مثال اس کی بھی دی ہے کہ توام اشخاص ارتکاب جرائم میں بسا اوقات باعتبار وقت اور نوعیت کے بھی ایک دوسرے کے ہمرکاب ہوتے ہیں اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو اس قسم کی مثالیں ہمیں ہندوستان میں بھی ملیں گی۔ قارئین نگار کی خاطر میں خود اپنی مثال پیش کرتا ہوں جو غالباً اُن کے لئے باعث دلچسپی ہوگی۔ یہ حالات پہلی مرتبہ صفحۂ قرطاس پر آرہے ہیں اور اگر نگار میں ماہرین نفسیات کے انکشافات جدید کا ذکر نہ آتا تو شاید ان حالات پر سے ابھی پردہ نہ اُٹھتا۔

سنئے۔ میں اور میرے بھائی ایک ہی دن کی پیدائش ہیں۔ صرف دو گھنٹہ کا چھوٹا بڑا ہے۔ اسی اعتبار سے ہم کو چھوٹا اور بڑا کہا جاتا ہے۔ ہمارے خد و خال ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ ہیں کہ بجز قریبی عزیز داروں کے دوسروں کے لئے ہم میں تفریق کرنا بہت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ گو ہماری عمر اس وقت تقریباً تیس سال ہے تاہم مشابہت کا یہ عالم ہے کہ اکثر لوگوں کو مغالطۂ شدید ہوتا ہے۔ اب کچھ روز سے میرے بھائی میں ایک بہت نمایاں امتیازی علامت پیدا ہوگئی ہے جس نے شناخت کے مسئلہ کو بہت ہی آسان کر دیا ہے۔ یعنی میرے بھائی کے اب داڑھی ہے اور میری حالت اس کے بالکل برعکس۔ ایک مرتبہ ایک شخص جو چند سال پہلے دہلی میں میرے بھائی کے ہم سبق رہ چکے تھے مجھے بمبئی میں دیکھ کر نہایت تپاک سے میری طرف بڑھے اور میرے بھائی کا نام لیکر مجھ کو مخاطب کیا اور فوراً ہی بغل گیر ہوئے۔ میں بڑی

مشکل سے اُن کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ میں نہیں بلکہ وہ میرے بھائی ہیں جو اُن کے ہم سبق رہ چکے ہیں۔ اس قسم کے واقعات بارہا ہم دونوں بھائیوں کو پیش آئے ہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں بہت سے خونچہ والوں اور "قلفی ملائی کا برف" بیچنے والوں کو غوطے دئے ہیں۔ لیکن وہ غریب کبھی وثوق کے ساتھ ہم میں شناخت نہ کر سکے۔ اگر مجھ سے تقاضا کرتے تو میں کہتا "میں نے نہیں میرے بھائی نے کھایا ہوگا"۔ میرے بھائی بھی انھیں الفاظ کو اپنے لئے ذریعہ نجات بنا لیا کرتے۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام خونچے والوں نے ہم کو اُدھار دینا بند کر دیا۔ لیکن ایک نیا اور اجنبی خونچہ والا ہماری چال کا شکار ہوئے بغیر نہیں بچتا تھا۔

ہم دونوں بھائی قد و قامت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی یکساں ہیں۔ ہم نے بارہا اپنا وزن کیا ہے اور ہمیشہ ایک ہی پایا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہمارے والدین ہم دونوں کو بیک وقت باہر نکلنے سے روکتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کہیں "بچوں کو نظر بد نہ ہو جائے"۔ ہماری مزاجی کیفیت ایک دوسرے سے اتنی مطابقت رکھتی ہے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے۔

ہمیں بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ امراض کے حملے ہم دونوں بھائیوں پر بیک وقت ہوئے ہیں اور مرض کی نوعیت بھی ایک ہی رہی ہے۔ چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ہم دونوں بھائی طبی معائنہ کے لئے لکھنؤ جھنوائی ٹولہ کے ایک متوسط عمر اور تجربہ کار حکیم کے پاس لائے گئے۔ وہ ہماری مشابہت کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ طلبار اور مریض حیرت و استعجاب کی گہری نظریں ہم پر ڈال رہے تھے۔ حکیم صاحب نے بڑی دلچسپی سے ہمارا معائنہ کیا۔ ہم نے فرداً فرداً اپنی شکایات ان کو بتائیں۔ حکیم صاحب نے میرے لئے ایک نسخہ تجویز کیا اور میرے بھائی سے کہا کہ "آپ بھی اسی کو استعمال کیجئے"۔

کچھ روز سے میرے ایک حصہ سر کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ دو ماہ قبل جب میں اپنے وطن گیا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ میرے بھائی کے سر کے بال بھی اُتنے ہی سفید ہو چکے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے بچپن میں جب کبھی میرے پھڑیاں نکلیں تو میرے بھائی کے ضرور نکلیں۔ ملیریا کا ہم دونوں بیک وقت متعدد بار شکار ہوئے ہیں۔ ہماری موجودہ صحت ایک ہی نقطہ پر ہے۔

ادبی ذوق تھوڑا بہت ہم دونوں میں موجود ہے۔ ہمارے عادات و خصایل اتنی یکسانیت رکھتے ہیں کہ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے۔ اشیائے خورد و نوش میں جو چیزیں مجھے مرغوب ہیں وہی میرے بھائی کو بھی۔ ہماری رائیں عموماً ایک پائی گئی ہیں۔ کچھ روز کا ذکر ہے کہ میرے ایک مخلص دوست نے کسی شاعر کا ایک تازہ ترین شعر اپنے مکتوب میں لکھا جو پہلے مری نظر سے نہیں گزرا تھا اور یہ دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہو سکتا ہے۔ میں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ یہ شعر غالباً جگر کا ہے۔ میرے بھائی سے بھی اسی شعر کے متعلق

رائے طلب کی گئی ۔ اُنھوں نے بھی وہی جواب دیا جو میں دے چکا تھا ۔ اس قسم کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں جن کا ہم کو وقتاً فوقتاً تجربہ ہوا ہے ۔

معاشی وسائل کے معاملہ میں ہم البتہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ میرے بھائی اپنے وطن میں طبابت کرتے ہیں لیکن میرے نصیب میں اہل فرنگ کی " دریوزہ گری " آئی ہے اور وہ بھی وطن سے بہت دور !!

ہم دونوں بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے اور دونوں ایک ایک بچی کے باپ ہیں ۔ ہمیں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت ہے جو ضرب المثل کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے ۔ لیکن باوجود اس مطابقت اور نفسیاتی یکسانیت کے، یہ کہنا کہ جب اس دُنیا سے روانگی کا وقت آئے گا تو ہم ساتھ ہی ساتھ سفر کریں گے بہت دشوار ہے ۔ بہرحال اگر ایسا ہو بھی تو ہم دونوں کا " سرِ تسلیم خم ہے "۔

ف ۔ ا ۔ ص ۔ بمبئی

یاد رکھئے !

بیوٹرین رجسٹرڈ

کیل، مہاسوں، بدنما داغوں، پھوڑے پھنسیوں، بھورے تل، مہاسوں، داد، چنبل خارش ۔ اگزیمہ اور جلدی بیماریوں کا مکمل علاج ہے

اور

بیوٹرین سنو

آپ کی خوبصورتی و ملاحت کو قایم رکھنے کے لئے ہے

قیمت پندرہ آنے

سول ایجنٹ :- ایس ۔ بی ۔ احمد، بہر سعادت خاں، طوطا میدہ دہلی

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے ۔ ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے ۔

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں ۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جوان، بوڑھے، سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور گشتہ جات بیکار ہیں ۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اسقدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمایئے ۔ اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا زبان کر لیجئے ۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دیگی اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹہ کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی ۔ یہ دوا خوارو کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دیگی ۔ یہ دوا نہیں ہے ہزاروں یوس العلاج اسکے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ۔ نہایت درجہ مقوی ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے ! القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی ۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دُنیا بھر میں نہیں ہے ۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ ر)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس ۔ فہرست دوافانہ مفت منگایئے ۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے ۔ نقالوں سے ہوشیار رہیے ۔ میری ۲۵ سالہ شہرت پر غور فرمایئے ۔

پتہ :- حکیم ثابت علی شیخ زبان، خوش کلام (عالم مثنوی مولانا روم صاحب)

محمود نگر ۳۴ لکھنؤ

مالہ وماعلیہ

جناب وحشت کلکتوی اُس دور شاعری کی یادگار ہیں، جب سخن سنجی و سخن فہمی کا تعلق زیادہ تر تغزل ہی سے تھا اور عشق و محبت کی دنیا "این و آں" سے بیگانہ تھی۔ "این و آں" سے میری مراد وہ جذبات انسانی ہیں جو جنسی رابطۂ کشش کے علاوہ، دوسری خواہشات سے متعلق ہیں اور جن میں اب رفتہ رفتہ اقتصادیات و سیاسیات اور عمرانیات و اخلاقیات سبھی کچھ شامل ہو گئے ہیں۔

حضرت وحشت کی غزل گوئی کے شباب کا زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں مخزن معیاری ادب کا پرچہ سمجھا جاتا تھا اور شیخ عبدالقادر (جو اس وقت تک سر نہ ہوئے تھے) از سر تا پا اسی کے تحسین و ترقی میں محو تھے۔ اقبال، نیرنگ، ناظر، ظفر علی خاں، سجاد حیدر اور وحشت، ان کے معاون تھے اور نظم و نثر کا بڑا دلکش و مفید ذخیرہ اس پرچہ کے ذریعہ سے فراہم ہو رہا تھا۔

ہر چند حضرت وحشت کے انتقادی مقالات بھی اس میں شایع ہوتے تھے، لیکن ان کی شہرت و عظمت زیادہ تر ان کی غزل گوئی ہی وابستہ تھی اور انھوں نے اپنا ایک رنگ الگ پیدا کر لیا تھا۔ جس میں وفا رامپوری کے علاوہ کوئی اور ان کا شریک و سہیم نہ تھا۔ چونکہ میرا مقصود اس وقت جناب وحشت کی غزل گوئی پر تبصرہ کرنا نہیں ہے، اس لئے اس کا موقعہ نہیں کہ میں اُن کے اور وفا رامپوری کے رنگ سخن کی خصوصیات سے بحث کر کے ان دونوں کے فرق کو نمایاں کروں، لیکن اس قدر عرض کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ جو شہرت وحشت کو نصیب ہوئی۔ اُس سے وفا محروم رہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب "قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است" کے علاوہ کچھ اور بھی ہو۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ وحشت اپنے تغزل کی سنجیدگی، معنی آفرینی اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال سے "غالب اسکول" کے نہایت کامیاب شاعر سمجھے جاتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ جس پختگی اور دلکشی کے ساتھ انھوں نے اس رنگ کو پیش کیا، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

یہ درست ہے کہ وحشت کا تغزل، میر و درد کے تغزل سے بالکل علٰحدہ تھا اور اس میں وہ والہانہ قلندری و ربودگی نہ پائی جاتی تھی جو بعض شعراء قدیم کے کلام میں نظر آتی ہے، لیکن جذبات کی بلندی، خیالات کی پاکیزگی اور حسن بندش کے لحاظ سے قدیم رنگ کی وہ ایک ارتقائی صورت تھی جس کی ابتدا غالب کے عہد سے

ہوئی تھی اور جو وحشت کو بہت محبوب و مرغوب تھی۔

وحشت نے اس انداز سخن میں کیا کیا گل کھلائے اس سے دنیائے شعر و سخن واقف ہے، لیکن میں نے ہمیشہ ان کی غزلوں کا مطالعہ محبت کی "گرانمایگی" ہی کو سامنے رکھ کر کیا اور اسی خصوصیت نے مجھے ان کا گرویدہ بنایا جذبات و خیالات میں تغیر ہونا ضروری ہے، لیکن اگر رسالۂ تجلی میں ان کی ایک غزل میری نگاہ سے نہ گزرتی، تو شاید میں وحشت کی شاعری کے متعلق اسی خیال پر قایم رہتا کہ انکا رنگ اب سے ۵۰ سال قبل تھا، وہی اب بھی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو:-

یہ رابطہ ظاہرداری کا کیوں مجھ کو دکھایا جاتا ہے — وہ مجھ سے نہیں ہے پوشیدہ جو مجھ سے چھپایا جاتا ہے
کیا اُس کی مشیت کی حکمت، کیا اپنی وجہِ ناکامی — ہوں اسکے سمجھنے سے قاصر جو مجھ کو بتایا جاتا ہے
آسان مٹانا اس کا نہیں مٹتے ہی مٹیگا نقشِ امید — کل پھر وہ بنایا جائے گا۔ جو آج مٹایا جاتا ہے
تقدیر کا ہر دن رونا ہے یعنی۔ کہ چراغ ارمانوں کا — ہر روز جلایا جاتا ہے۔ ہر روز بجھایا جاتا ہے
اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے — جو بار اُٹھانا پڑتا ہے، کیونکر وہ اُٹھایا جاتا ہے
یہ بھی ہے تماشا اُلفت کا۔ جو بات ہے وہ نادانی کی — منظور نہیں ہے ربط جنھیں، ربط اُن سے بڑھایا جاتا ہے
جب شعر و سخن سے وحشت کو باقی نہ رہی ہو دلچسپی — حیران ہوں پھر کیوں محفل میں یہ شخص بلایا جاتا ہے

اگر یہ غزل وحشت کے نام سے شایع نہ ہوتی، تو شاید میں کبھی یقین نہ کرتا کہ ان کا کلام ہے، لیکن چونکہ بالتحقیق یہ انھیں کی غزل ہے، اس لئے حیران ہوں کہ ان کے اس رنگ کی (جو یقیناً بہ لحاظ انداز بیان اُن کے عہدِ شباب کے رنگ سے مختلف ہے) داد کن الفاظ میں دوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس رنگ کی غزلیں وحشت نے اور بھی کہی ہیں یا نہیں، لیکن اگر کہی ہیں تو ان سب کے متعلق میں ان سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ انھوں نے کیوں مجھے ان سے محروم رکھا، اور اگر یہ رنگ ان کے کلام میں ابھی پیدا ہوا ہے تو میں اُن کو مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے تو لوگوں کا صرف سر جھکتا تھا، لیکن اب انکے اس رنگ کے سامنے روح دوزانو ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بحر اور ردیف و قافیہ سے انداز بیان کا بڑا تعلق ہے اور اس غزل کی بحر و ردیف زیادہ تر سادگی ہی کو چاہتی ہے، لیکن وحشت کے لئے یہ کوئی ایسی مجبوری نہ تھی کہ وہ اپنے قدیم رنگ سے ہٹ کر اس زمین میں ایسی نکر کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وحشت کے جذبات ہی میں تبدیلی ہوئی ہے اور یہ وہی تبدیلی ہے جو ہر فطری شاعر کے انتہائی عروج فکر کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہے۔

یوں تو اس غزل کے تمام اشعار بیان کی سادگی جذبات کی پاکیزگی، تاثرات کی گہرائی اور رفعت خیال کے

لحاظ سے بے مثل ہیں، لیکن اس کا پانچوں شعر تو یقیناً "ماوراء شعر" ہے اور اس کی صحیح داد نہ کچھ لکھ کر دیجا سکتی ہے نہ خاموش رہ کر۔

اللہ رے زورِ مجبوری، خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اُٹھانا پڑتا ہے، کیونکر وہ اُٹھایا جاتا ہے

افسوس ہے کہ میں وحشت سے بہت دور ہوں، ورنہ میں خود اُن سے جاکر پوچھتا کہ اس شعر کی تخلیق کیونکر ہوئی اور وہ کونسا حال تھا جو اس "الہام پارہ" کے نزول کا باعث ہوا۔

مقطع میں وحشت نے شعر و سخن سے دلچسپی باقی نہ رہنے کا ذکر کیا ہے، اسے تو خیر میں نہیں مان سکتا، لیکن دوسرے مصرعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ضرور متفق ہوں، کیونکہ جب شاعر ترقی کر کے صرف شخص رہ جاتا ہے تو وہ محفل کی چیز نہیں رہتا، بلکہ اُس کے خلوتکدہ سے خود انجمنیں پیدا ہوتی ہیں اور انجمنیں بھی وہ جہاں

جولانگہِ پرِ توِ ماہ اندکتانہا !

غزل کے تیسرے شعر کے متعلق مجھے البتہ کچھ کہنا ہے۔ پہلے مصرعہ میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر چند نقش اُمید مٹانا آسان نہیں تاہم رفتہ رفتہ وہ مٹ ہی جاتا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں پوری قوت کے ساتھ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ "کل پھر وہ بنایا جائے گا"، اور اس صورت میں اس کے مٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کیونکہ مٹانے اور بنانے کا سلسلہ تو برابر قایم ہی رہیگا۔ اس لئے اگر دوسرا مصرعہ یونہی رکھا جائے تو پہلا مصرعہ ایسا ہونا چاہئے جس سے یہ مفہوم پیدا ہو کہ "نقشِ امید" کا مٹانا کسی طرح ممکن ہی نہیں، اور اگر پہلے مصرعہ کو اسی طرح رکھا جائے تو پھر دوسرے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا ایسا ہونا چاہئے جو "نقشِ امید" کے مٹنے کے امکان کو ظاہر کر سکے مثلاً: "کل پھر وہ کچھ کچھ اُبھرے گا"

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ شعر غلط ہے یا جس مفہوم کو شاعر ظاہر کرنا چاہتا ہے، وہ اس سے ظاہر نہیں ہوتا لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا وہ ایک ایسی بات ہے جو کہی جا سکتی ہے اور وحشت کی ہموار شاعری میں ہلکی سی ہلکی رشکن بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

ضرورت ہے

ادارۂ نگار کے لئے ایک ایسے ادیب کی جو انگریزی اور عربی سے نہایت صاف و شگفتہ ترجمہ کر سکے، سنجیدہ ذوق کے مضامین لکھ سکے، اور میری عدم موجودگی میں نگار کی باقاعدہ ترتیب اشاعت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے سکے۔ اسی کے ساتھ دارالاشاعت کی نگرانی بھی اس کے سپرد ہوگی۔ مشاہرہ معقول دیا جائے گا۔

اڈیٹر نگار

بابُ الاستفسار

تعلقات زن وشو

(جناب غلام ربانی عزیز۔ گورنمنٹ کالج، ملتان)

بعض فقہی کتب میں میری نظر سے گزرا ہے۔ کہ اگر بیوی بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر دے، تو خاوند اسے خلاف مرضی اس امر پر مجبور نہیں کر سکتا۔ بلکہ اسے بچے کی پرورش کا کوئی اور انتظام کرنا پڑے گا۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ کہیں میری نظر سے یہ بھی گزرا ہے کہ کھانا پکانا اور برتن دھونا بھی بیوی کے فرایض منصبی میں شامل نہیں ہیں اور اگر میاں بیوی میں اس معاملہ میں تنازع ہو جائے اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت آجائے تو فیصلہ عورت کے حق میں ہوگا۔

آپ کی رائے میں شریعت کا زاویۂ نگاہ کیا ہے۔ اگر فقہا کے فتاوے سے امداد لی جا سکے تو اور زیادہ مفید ہوگا۔ آپ کو اس سلسلہ میں تکلیف اس لئے دی گئی کہ آپ زمانہ کے اقتضا کو پیش نظر رکھتے ہوئے فتوے دیں گے

(نگار) میاں بیوی کا رشتہ بڑا نازک و پیچیدہ رشتہ ہے، کیونکہ اس کا تعلق ایک طرف ذاتیات سے ہے اور دوسری طرف اجتماعیات سے بھی۔ یعنی اس تعلق کا ایک پہلو تو وہ ہے جو میاں بیوی کے ذاتی میلانات سے وابستہ ہے اور دوسرا وہ جو سوسائٹی اور سماج کے نظام سے تعلق رکھتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جنسی میلانات کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے جتنی اجتماعی و تمدنی مصالح کو اور اسی کو پیش نظر رکھ کر "ادارۂ نکاح" قایم کیا گیا، ورنہ جنسی خواہش تو بغیر نکاح کے بھی پوری ہو سکتی ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ جب زن و شو کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو زیادہ تر اجتماعی نقطۂ نظر ہی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت سے میاں بیوی کے تعلقات کیا ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ جنسی میلان اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ وہ کسی نتیجہ پر غور کرے، کیونکہ بھوک پیاس کی طرح وہ بھی ایک فطری خواہش ہے جسکو انسان

پورا کرتا ہے، لیکن جس طرح غذا کا مقصود صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ زندہ رہ کر مفید کام کرنا ہے، اسی طرح نکاح کا مقصود بھی صرف جنسی خواہش پورا کرنا نہیں بلکہ توالد و تناسل قایم رکھ کر اچھے افراد قوم پیدا کرنا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میاں بیوی کی حیثیت مرد و عورت ہونے کے لحاظ سے اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی ماں باپ ہونے کی اور اسی حیثیت کو سامنے رکھ کر مذہب یا سماج ازدواجی تعلقات کے لئے کچھ مخصوص قواعد مرتب کرتا ہے — پھر جب صورت یہ ہے تو میاں بیوی کے تعلق میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ دونوں اُن فرائض کو محسوس کرتے ہیں یا نہیں جو اجتماعی حیثیت سے ان پر عاید ہوتے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اس کا احساس نہیں رکھتا، تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کا تعلق ازدواج قایم رہے۔

آپ نے جو مثالیں دی ہیں وہ غیر واضح ہیں۔ اگر بیوی، بچہ کو دودھ پلانے یا کھانا پکانے یا گھر کے دوسرے کام کرنے سے اس لئے انکار کرتی ہے کہ اس کی صحت اجازت نہیں دیتی یا یہ کہ شوہر ان کاموں کے لئے کوئی اور معقول انتظام کر سکتا ہے، تو اس کا انکار یقیناً حق بجانب ہے اور عدالت شوہر کو مجبور کرے گی کہ وہ کوئی اور انتظام کرے، لیکن اگر یہ انکار صرف بر بنائے تمرد و شرارت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو ان کاموں پر مجبور نہ کیا جائے اور اگر وہ نہ مانے تو یقیناً مرد کو حق حاصل ہوگا کہ وہ ایسی بیوی کو طلاق دیدے جو نظام تمدن میں اس کی معاون و ہمنوا نہیں۔

اس سے پہلے تو نہیں، لیکن اب تعلیم جدید نے ہندوستان کی عورتوں میں یہ میلان ضرور پیدا کر دیا ہے کہ وہ گھر کے کاموں سے الگ رہیں اور یہ میلان حد درجہ خطرناک ہے۔

مغرب میں اس میلان نے جو آفت برپا کر رکھی ہے اور عورتوں کی بڑھی ہوئی آزادی نے مرد کو جتنا پریشان کر رکھا ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ امریکہ میں اس وبا کے روکنے کے لئے ایک سوسائٹی "تحفظ نکاح" کے نام سے قایم ہوئی ہے، جس کے ممبروں کی تعداد ساڑھے چودہ لاکھ تک پہونچ گئی ہے اس سوسائٹی کا مقصود یہ ہے کہ نکاح کے تعلق کو پایدار بنایا جائے اور طلاق کی آسانیوں کے خلاف احتجاج کیا جائے۔

اس سوسائٹی نے جو حالات و واقعات یا اعداد و شمار اس وقت تک فراہم کئے ہیں وہ بہت عجیب و غریب ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں شادی و طلاق کا اوسط چار اور ایک کا ہے اور طلاق کا اوسط برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ مثلاً چکاگو میں اخیر نومبر تک ۱۳۹۴۶ طلاق کی درخواستوں کو منظور کیا گیا حالانکہ لڑائی سے قبل سالانہ اوسط صرف ۵۵۸۰ تھا۔

جو عدالتیں طلاق کی درخواستیں سنتی ہیں ان پر اتنا بار پڑ گیا ہے کہ ججوں کو صبح ۸ بجے سے ۵ بجے شام

تک مسلسل بیٹھنا پڑتا ہے اور انھیں اتنا وقت بھی نہیں ملتا کہ وہ فریقین کی گواہیاں سُن سکیں طلاق کی درخواست دینے والے (جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے) ایک قطار میں جج کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ایک ایک درخواست کو لیکر صرف اتنا پوچھتا ہے کہ "جو کچھ اس درخواست میں لکھا ہے وہ ٹھیک ہے؟" اور اس کا جواب ملنے پر بغیر طلب شہادت یا جرح و صفائی، منسوخی نکاح کی مہر لگا کر، طلاق کا حکم صادر کر دیتا ہے، جو چند سکنڈ کا کام ہے۔

امریکہ کے ہر شہر کا یہی حال ہے، اور خصوصیت کے ساتھ سواحل مگر نیو میں تو طلاق کا خبط اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہاں سے طلاق چاہنے والوں کی اسپشل ٹرینیں روانہ ہوتی ہیں اور جو لوگ صدر مقام تک پہونچنے کے لئے اتنا لمبا سفر اختیار نہیں کر سکتے وہ ڈاک کے ذریعہ سے اپنی درخواست بھیج دیتے ہیں اور ڈاک ہی کے ذریعہ سے طلاق نامہ مل جاتا ہے۔

وہاں کے قانون طلاق کی رو سے "ذہنی یا دماغی ظلم" بھی حصول طلاق کے لئے کافی ہے اور یہ اتنا وسیع المعنی لفظ ہے کہ اس کی بنا پر نہایت آسانی سے طلاق حاصل ہو جاتی ہے۔ ان دماغی و ذہنی مظالم کی فہرست ملاحظہ فرمائیے:۔ اگر شوہر یا بیوی میں سے کوئی خراٹے لیتا ہے، کسی کو ہچکیاں زیادہ آتی ہیں، یا کوئی عورت ہر وقت بنتی رہتی ہے، تو یہ تمام باتیں وہاں "ذہنی ظلم" میں شمار کی جاتی ہیں۔ ایکبار وہاں کے عدالت نے صرف اس بناء پر عورت کو شوہر سے چھٹکارا دلا دیا کہ شوہر اکثر بموں کا ذکر کیا کرتا تھا اور بیوی کا حساس دماغ اس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

الغرض یہ "ذہنی ظلم" ایسا وسیع عذر ہے کہ چار مقدموں میں تین اس عذر کی بنا پر فیصل کئے جاتے ہیں اور چونکہ اس ظلم کی شکار عورت ہی زیادہ ہوتی ہے اس لئے سو میں ۹۲ درخواستیں عورتوں ہی کی ہوتی ہیں جن میں سے بعض صرف یہ وجہ بیان کرتی ہیں کہ "میں اپنے شوہر سے اب بیزار ہو گئی ہوں" اور اس بیزاری کا سبب بھی دریافت نہیں کیا جاتا۔

کارلس پامر (ہالی وڈ اسٹار) نے صرف اس بناء پر طلاق حاصل کی کہ اس کا شوہر فسانہ نگار تھا اور جب شام کو کارلس پامر کے احباب آتے تھے تو وہ ان کو اپنے افسانے سنانے بیٹھ جاتا تھا اور لوگ گھبرا اُٹھتے تھے۔

ایک اور اسٹار این ہارڈنگ نے صرف اس عذر پر طلاق حاصل کی کہ اس کا شوہر جہاں جاتا تھا لوگ اس کو دیکھ کر کہتے تھے کہ "دیکھو یہ ہے این ہارڈنگ کا شوہر" اور وہ اسے پسند نہ کرتی تھی کہ لوگ خود شوہر کی ذاتی اہمیت کو سامنے نہ رکھیں اور اس کی وساطت سے اسے پہچانیں۔

سنٹ لوئی کی ایک عورت نے درخواست دی کہ "رات کو میرا شوہر جب میری پیٹھ کھجاتا ہے تو مجھے بڑا لطف آتا ہے، لیکن کبھی کبھی وہ اس سے انکار کر دیتا ہے اور مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے"۔ جج نے اس عذر کو معقول سمجھ کر طلاق دلوادی۔

ایک عورت کی درخواست طلاق اس بنا پر منظور کر لی گئی ہے کہ اس کا شوہر رات کو سوتے وقت اطالوی زبان میں بڑبڑاتا تھا جس سے اسے سخت نفرت تھی۔

اس بیان سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر تعلق ازدواج کے باب میں عورت کو زیادہ آزادی دیدی جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے میاں بیوی دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں اور مرد کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ عورت کو ایسے کاموں کے کرنے پر بھی مجبور کرے، جن پر عورت قادر نہیں ہے یا جن کے انجام دینے سے اس کی صحت پر خراب اثر پڑ سکتا ہے یا جن کے انجام دینے کے لئے مرد کو کوئی دوسرا معقول انتظام کر سکتا ہے۔ یہ ہے اس مسئلہ کی انسانی، اخلاقی و اجتماعی حیثیت اور اسی کی بنا پر فقہی حیثیت قایم ہونا چاہئے۔ جب اس قسم کی نزاع میاں بیوی میں پیدا ہوگی تو یقیناً یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ عذر معقول ہے یا نہیں، اور اگر اس کے دیکھے بغیر عورت کے حق میں فیصلہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ یہاں بھی وہی ہوگا جو اسوقت امریکہ میں نظر آرہا ہے اور ہمارا معاشرتی و معیشتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

آئندہ کسی اشاعت سے

ہم ایک ایسے ادبی شاہکار کا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں جس کی نظیر آپ کو شاید ہی کہیں دوسری جگہ مل سکے۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے جو اپنی غیر معمولی نزاکت خیال اور دلدوز انداز بیان کے لحاظ سے دنیا کا موثر ترین المناک افسانہ سمجھا جاتا ہے اور ایسے گہرے نقوش الم چھوڑ جاتا ہے جس کو آپ کبھی محو نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اشاعت ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

اڈیٹر نگار

تعارف

آنکه در شهر تو دور از شهر زیست
هیچ میدانی غریب شهر کیست!

عارفی در صحبتِ صاحبدلان
بت برستی با برهمن بچگان،

در کفِ من سبحه در بیت الصنم
بر جبینم شقه ای اندر حرم

هم بکعبه بسته ام زنار ها
داشتم با کفر و ایمان کار ها

گل رخان و نازنینان داشتم
رشته ای با مه جبینان داشتم

در کمندِ من غزالانِ حرم
دامها بر آهوان افگنده ام

ناز نینان ناز ها فرموده اند،
دلبران آغوش ها بکشوده اند

در دیارم شعله رویان بی نقاب
در کنارم ماهتاب و آفتاب

اے خوشا عهد شباب ساده کار
سجده های شوق بر پای نگار

چشمها بر ماه و انجم دوختن
در غمِ زهره جبینان سوختن،

رقص کردن گه بآهنگِ رباب
باده خوردن گه بنور ماهتاب

مطرب و موجِ گل و ابرِ بهار
رامش و رنگ و رباب و چنگ و تار

صبح صبح جلوهٔ روئے نگار
شام شام وعدهٔ بوس و کنار

دست در دستِ نگار سیم تن
لب بلب های بتِ شکر شکن

بتکده بر دوش و کعبه در کنار
من همانم مومنِ زنار دار

ظرف اگر داری بسوئے من بیا
میفروشم بادهٔ خیام را

من نمی گویم که عهدِ جام رفت
آبروئے حافظ و خیام رفت

بیش ازین حالِ جنون من مپرس
انتهائے چاکِ پیراهن مپرس

خانمان برباد دادم در وطن،
سوختم کاشانه ها اندر چمن،

از دیار کافران برخاستم
در میانِ مومنان تنها ستم

باده از خونابهٔ دل میکشیم
بوسه ها بر تیغ و خنجر می زنیم!

پروفیسر شور

کیفِ خیال

سوزِ مجسم، دردِ کمال — اور کہوں کیا اپنا حال
شرم سے ان کی مجھ کو ملال — کیسے کیجے عرضِ سوال
دل میں غم کا ہے یہ حال — جیسے شیشے میں ہو بال
حُسن! ترا ہے یہ کیا حال — بھیگی پلکیں، جلتے گال،
صبر مصیبت، ضبط محال — عشق کے مارے ہیں بے حال
رسم کے پھندے زہد کے جال — تجھ کو نہ کر ڈالیں پامال
کاش انھیں میں چھو سکتا — نرم سنہرے بکھرے بال
نرم کسک ہے دل کے قریں — کس کا آیا مجھ کو خیال،
عشق کی راہیں کاٹتا ہوں — ٹوٹی سانسیں، پاؤں نڈھال
رنگِ زمانہ دیکھو تو،، — آگ کے بادل، خون کے تال
حُسن، ترا ہی صدقہ ہے — شعر و سخن اور کیفِ خیال
لطف کی اب تو ایک نظر — روتے روتے ہوں بے حال
گھوم رہا ہے آنکھوں میں — حُسن کا عالم، شامِ وصال
بیت رہے ہیں زیست کے دن — آنکھ میں آنسو، لب پہ سوال
ہاں اشعرؔ کو بھی دیکھا — کتنا غمگیں، کتنا نڈھال

اشعرؔ ملیح آبادی

کلام امتہ الرؤف نسرین :

عجب نہیں تری ہلکی سی مسکراہٹ سے
مری حیات کا وقفہ طویل ہو جائے !

آئینہ دیکھ کر خیال آیا
تم مجھے بے مثال کہتے تھے

تم نہ آجاتے تو ایوانِ تصور میں ابھی
دل کے بہلانے کی خاطر اور بھی ہنگامے تھے

غمِ زمانہ بھی رکھتا ہے ایک خاص گداز
شریک کرلیں اسے بھی غمِ محبت میں

ماضی کے محل سرا میں آؤ
یادوں کے حسیں دئے جلائیں

اب تیرے بغیر زندگانی
بے معنی سی بات ہوگئی ہے

ہم تلخیِ حیات سے آگاہ ہوگئے
تیری نظر نے فکر کو سنجیدہ کردیا

ٹھہر ٹھہر کے کنارے لگا مری کشتی
کہ ناخدا! مرا دل ڈوبتا ہے ساحل پر

غزل : قہر اکبر آبادی

غم میں بھی قہقہے ہیں ، نہیں ہوشِ غم ابھی
اُٹھتا ہے دل میں درد تو ہنستے ہیں ہم ابھی

سمجھیں ترے فریبِ کرم کو بھی ہم کرم
اتنے بھی ہوش سے نہیں بیگانہ ہم ابھی

اس دل کے اضطراب نے رسوا کیا ہمیں
پہونچے وہیں جہاں سے اُٹھ آئے تھے ہم ابھی

منزل کا اب نشان جو ملجائے کیا عجب
آئے نہیں ہیں راہ میں دیر و حرم ابھی

دامن بچا کے قہر گزر بھی گیا کوئی
اور ہیں تلاشِ حسنِ طلب ہی میں ہم ابھی

دلچسپ معلومات

ایک کمزور لیکن نہایت دیرپا مخلوق

ماہرین حیات کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی شے قایم نہیں رہ سکتی جو یہاں کی کشمکش حیات سے کامیاب گزر جانے کی قوت نہ رکھتی ہو۔ چنانچہ آج سے چند ہزار برس پہلے دنیا میں بڑے بڑے عظیم الجثہ جانور موجود تھے اور ان میں طاقت و قوت کی بھی کمی نہ تھی مگر چند فطری نقائص کی وجہ سے باقی نہ رہ سکے اور فنا ہو گئے لیکن اس مسلمہ کے خلاف ہم کو بعض ایسی حیرت انگیز مثالیں بھی ملتی ہیں کہ باوجود حد درجہ ناقص اور کمزور ہونے کے بعض جانور ابتک فنا نہیں ہوئے۔ یورپ میں ایک مکھی پائی جاتی ہے جسکو مے فلائی (may fly) کہتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اس مکھی کے نہ تو منہ ہوتا ہے اور نہ پیٹ اور یہ اپنی پیدائش کے چند ہی گھنٹے بعد مر جاتی ہے، وہ اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ وہاں کی سردیوں کو برداشت بھی نہیں کر پاتی۔ اس لئے صرف گرمی کے موسم میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر ان تمام کمزوریوں کے باوجود ابھی تک اس کی نسل فنا نہیں ہوئی۔ گرمی کے موسم کے بعد یہ مکھی کہیں نظر نہیں آتی مگر گرمیوں کے شروع ہوتے ہی یہ پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مکھی کی مختصر سی داستان حیات یہ ہے کہ گرمیوں کے موسم میں یہ مکھی کسی تالاب، نالی یا نم جگہ پر انڈے دیدیتی ہے۔ یہ انڈے مہینوں تک اسی حالت میں پڑے رہنے کے بعد لمبے پتلے کیڑوں میں بدل جاتے ہیں۔ ان کیڑوں کے منہ سے لعاب نکلتا رہتا ہے جس میں لپٹ کر وہ گول گیند کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس حالت میں اُن کو ڈیڑھ دو سال گزر جاتے ہیں، مگر ابھی تک یہ صحیح معنی میں مکھی نہیں بنے، جب تیسری فصل گرمی کی ختم ہو جائے گی تو اس گیند سے پوری مکھی نکلے گی۔ اس کا منہ تو ہوتا ہے مگر حلق نہیں ہوتا اور اس طرح وہ صرف ایک نمائشی چیز ہے اور اس سے کھانے پینے کا کام نہیں لیا جاتا اور اس لئے اس کے پیٹ میں بھی غذا ہضم کرنے کے اعضا نہیں ہوتے۔ یہ مکھی پیدا ہوتے ہی نر مکھی کی تلاش کرتی ہے۔ جس سے ملتے ہی انڈے پیدا ہو جاتے ہیں اور انڈے دینے کے چند گھنٹے بعد وہ فاقہ کی مصیبت میں پڑ کر مر جاتی ہے۔

ایٹم بم کیوں اتنا مہلک ہے

اگست ۱۹۴۵ء کی دو تاریخیں، پانچ اور آٹھ (جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے گئے) کرۂ ارض کی تاریخ میں کبھی نہیں بھلائی جا سکتیں، کیونکہ ان تاریخوں میں زمین نے تباہیوں کا جو زبردست طوفان دیکھا وہ کرۂ ارض کیا خود آفتاب میں بھی کبھی نہیں دیکھا جاتا۔

جس وقت یورینیم میں انفجار (Explosion) پیدا ہوتا ہے تو سکنڈ کے لاکھویں حصہ میں کھرب اندر کھرب اجزا نیوٹرن کے منتشر ہو کر فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ ان اجزا کی کثرت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک پونڈ یورینیم سے یورینیم کے جتنے اجزا پیدا ہوتے ہیں ان کو اگر آپ اعداد میں ظاہر کرنا چاہیں تو ۱ ہندسہ کے بعد آپ کو ۲۵۰ صفر بڑھانا پڑیں گے۔

ہیروشیما میں جو بم گرایا گیا تھا اس میں حسب بیان پریسیڈنٹ ٹرومین ۲۰ ہزار ٹن وزن کے معمولی بموں کی طاقت تھی، گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس میں یورینیم کی مقدار ۲۰ پونڈ سے زیادہ نہ تھی اور چونکہ یہ بہت وزنی ہوتا ہے اس لئے صرف تین انچ کی نلکی میں آگیا ہوگا۔

یورینیم کی انفجاری قوت کا اندازہ کرنا تصور انسانی سے باہر ہے، بم پھٹنے سے اجزاء اور یم فضا میں ہلچل مچا کر ایک ایسی بھاپ والی آندھی پیدا کر دیتے ہیں جس کی رفتار نصف میل تک دس لاکھ میل فی گھنٹہ رہتی ہے اور اس کے بعد بھی ۵۰۰ میل فی گھنٹہ سے کم نہیں ہوتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک میل کے اندر اندر جو چیز اس کی زد میں آتی ہے بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے اور اس کے بعد بھی آندھی کا زور اتنا رہتا ہے کہ اگر پہاڑ بھی سامنے ہو تو خاک ہو کر اڑ جائے۔

یورینیم کے پھٹنے سے فضا کا ٹمپریچر اتنا ہی گرم ہو جاتا ہے جتنا آفتاب کا اور اسی لئے بم پھٹنے کی جگہ سے سو میل کی دوری پر بھی جو روشنی دیکھی گئی وہ آفتاب کی روشنی سے زیادہ تیز تھی۔

ایک بیوی کے لئے تین شوہر درکار ہیں

امریکہ کی ایک خاتون کا بیان ہے کہ زمانہ کے اقتضاء اور زندگی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو دیکھتے ہوئے اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ایک عورت کو تین شوہروں کے رکھنے کی اجازت دیجائے۔

ایک شوہر کاروباری ہونا چاہئے جس کی خدمات یہ ہوں:۔
کاروبار کی دیکھ بھال، دفتر کا انتظام، کانفرنسوں کی شرکت وغیرہ۔

دوسرا گھریلو شوہر جس کی خدمات یہ ہوں:۔
گھر کی صفائی کا اہتمام، خانہ باغ کا انتظام، فرنیچر وغیرہ کی فراہمی، گھر کی عورتوں کا انصرام وغیرہ۔

تیسرا قلبی شوہر جس کی خدمات صرف یہ ہوں کہ وہ ہر وقت بیوی کی نگاہ دیکھتا رہے اور اسکی رنگین صحبتوں کو کامیاب بنائے ـــــ افسوس ہے کہ خاتون موصوفہ اسی کے ساتھ یہ ظاہر کرنا بھول گئیں کہ عورت کو یہ اختیار بھی حاصل ہونا چاہئے کہ جب چاہے وہ ان شوہروں کو نکال کر ان کی جگہ دوسرے شوہر فراہم کر سکتی ہے۔

آسٹریلیا کے چوہے

ان تمام جانوروں میں، جنھوں نے انسان کی زندگی تلخ کر رکھی ہے، آسٹریلیا کے چوہوں سے زیادہ تکلیف دہ کوئی نہیں ـــــ یہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں دفعتاً معلوم نہیں کہاں سے نمودار ہوتے ہیں اور دو چار دن میں لاکھوں روپیہ کا نقصان کر کے دفعتاً غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ سیلاب اور طوفان کی طرح آتے ہیں، لیکن کس طرح کہاں سے آتے ہیں اسکا پتہ آجتک معلوم نہیں ہو سکا۔ ـــــ لوگ غافل سوتے ہوتے ہیں کہ بہت تڑکے کھرچنے، کترنے اور چیں چیں کی آواز سننے میں آتی ہے اور جب لوگ بیدار ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کپڑوں، جوتوں، کتابوں، کھانے کی چیزوں، میزوں اور تصویروں پر چوہوں کا عمل بربادی جاری ہے ـــــ ہر چند یہاں تمام چیزیں مضبوط صندوقوں میں بند ہوتی ہیں اور جب یہ حملہ ہوتا ہے تو کتے، بلی چھوڑ دئے جاتے ہیں، سنکھیا کی گولیاں بکھرا دیجاتی ہیں، لیکن ان سے نجات کسی طرح نہیں ملتی۔ قریب کے شہر سے ٹیلی فون آتا ہے کہ چوہے آرہے ہیں ہوشیار ہو جاؤ اور لوگ جواب دیتے ہیں کہ آرہے کیا معنی وہ یہاں پہونچ بھی گئے اور جنگ جاری ہے ـــــ لوگ مٹی کے تیل کے کنستروں کا منھ کاٹ کر میز کے چاروں پائے ان میں رکھدیتے ہیں تاکہ کھانا کھانے کے وقت چوہے میز پر نہ آسکیں، پاجامے کے پائنچے نیچے سے باندھ لیتے ہیں تاکہ اسکے اندر نہ گھس سکیں اور دونوں ہاتھوں سے ان چوہوں کو بھگاتے رہتے ہیں لیکن سب تدبیریں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔

یہ اتنے بھوکے ہوتے ہیں کہ سنکھیا کی تمام گولیاں کھا جاتے ہیں اور سوائے چند کے کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ دوپہر تک کتے بھی بھونک بھونک جب تنگ آجاتے ہیں تو خاموش بیٹھ جاتے ہیں لیکن چوہے پھر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور پھر انھیں بھگا دیتے ہیں۔ بلیوں کا بھی یہی حال ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی جگہ انھیں پناہ کی ملجاتی ہے تو پھر وہ ڈر کے مارے باہر نہیں نکلتیں ـــــ گائیں دوہی جاتی ہیں اور ان کا دودھ پھینک دیا جاتا ہے، گھوڑے بھوکے رہتے ہیں کیونکہ ان کا چارہ کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اور شام تک ہزاروں ایکڑ کھیتی میں سے ایک دانہ بھی باقی نہیں رہتا ـــــ رات کو جب سونے کا وقت آتا ہے، تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں اور کیسے سوئیں، کیونکہ چٹائیاں دریاں اور گدے سب ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہوتے ہیں اور اگر کسی طرح سر ٹکایا بھی جائے تو دفعتاً چھت کے سوراخ سے ایک چوہا اوپر آگر گرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ساری چھت گویا چلنی ہو جاتی ہے جسکے سوراخوں سے چوہے کودنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں کہ روشنی کر کے کتاب پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ موم بتی کو چوہے کھا چکے ہیں اور کتاب ریزے ریزے ہو چکی ہے۔ یہ حال برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک ہفتہ کے بعد وہ از خود غائب ہو جاتے ہیں، لیکن شہر کو اس حال میں چھوڑ جاتے ہیں گویا یہاں سے

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱ - چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ - مادئین کا مذہب

۳ - حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات متعدد عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی بھرپور اڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا خاص طباعت کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ مہلک ہے زبان پلاٹ انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً۔ مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں تمام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے

رجسٹرڈ نمبر ایل ۶۶۴

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں سے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۴ء

(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سرخنامۂ جرأت اشتہار

ایک سال چھ ماہ تین ماہ ایک ماہ

ایک صفحہ ۲۰ روپیہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۲ روپیہ

آدھ صفحہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۱ روپیہ

چوتھائی صفحہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۲ روپیہ ۱ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر ۱۲ روپیہ

ششماہی جاری نہیں ہو سکتی

سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ کسی طرح نہیں ملے گا۔

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات

اور قواعد طلب کیجئے

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل درخواست